مجالسِ ابوذرِ زماںؒ



محسنِ ملت ابوذرِ زماں

علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ

دربارِ حسینؑ

(عشرہ محرم الحرام پر مشتمل شاہکار کتاب)

مجموعۂ تقاریر

حجۃ الاسلام والمسلمین ابوزمان حضرت علامہ

سید صفدر حسین نجفی مرحوم پرنسپل جامعۃ المنتظر

مرتبہ

مولانا ندیم عباس حیدری علوی

ناشر

اِدارہ منہاج الصالحینؒ

جناح ٹاؤن، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور۔ فون : 5425372

کتاب : دربارِ حسینؑ

تقاریر : علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم

مرتب : مولانا ندیم عباس حیدری علوی

پیش کش : حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضل قم

موضوع : مجالسِ عزا

پروف ریڈنگ : غلام حبیب

تعداد : 1000

اشاعت : جون 2009ء

ہدیہ : [redacted] روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ منہاج الصالحین ۔ لاہور

الحمد مارکیٹ فسٹ فلور دکان نمبر 20 - غزنی سٹریٹ - اردو بازار - لاہور

فون: 042-7225252 ، 0301-4575120

فہرست

خطبہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ ، اَلرَّسُوْلِ الْمُسَدَّدِ وَالْمُصْطَفٰى الْاَمْجَدِ وَالْمَحْمُوْدِ الْاَحْمَدِ سَيِّدِنَا وَنَبِيِّنَا اَبِى الْقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ الْمَعْصُوْمِيْنَ وَاللَّعْنَةُ الدَّائِمَةُ عَلٰى اَعْدَائِهِمْ اَجْمَعِيْنَ –

رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْ ○ وَيَسِّرْ لِىْٓ اَمْرِىْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِىْ ○ يَفْقَهُوْا قَوْلِىْ ○

(سورۂ طٰہٰ، ۲۵–۲۸)

اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى فِىْ مُحْكَمِ كِتَابِهِ الْمَجِيْدِ

عرضِ ناشر

برصغیر پاک و ہند میں اسلام حقیقی یعنی تشیّع کا پرچار مجالس سید الشہداءؑ کا مرہونِ منت ہے۔ مذہب حقہ شیعہ خیرالبریہ سے تعلق رکھنے والے علم و عمل سے مزین ذاکرین عظام نے خلوصِ نیت و عمل سے مودت اہلِ بیتؑ کا عملی ثبوت دیتے ہوئے مکتبِ آلِ اطہارؑ اور مسلکِ آئمہ اَبرار کی تبلیغ و اشاعت کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ان بزرگوں نے اس سلسلے میں نذر و نیاز کے لالچ سے بے نیاز ہوکر بغیر کسی دنیاوی صلے کی پروا کے کئی کئی کوس کے پیدل سفر کیے اور عوام الناس کو درسِ گاہ کربلا کے آفاقی پیغام سے آشنا کیا۔ یوں اُن کا صدق و خلوص رنگ لایا اور لوگوں کو اصول و فروعِ دین سے آگہی نصیب ہوئی۔ نیز عزاداریِ مظلومِ کربلا کو فروغ ملا۔

قیامِ پاکستان کے بعد برسرِ منبر تبلیغ کا یہ سلسلہ تو شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ جاری رہا۔ لیکن ارضِ پاکستان میں مدارسِ دینیہ کی کمی شدت سے محسوس کی گئی۔ چند علمائے کرام نے جن مدارس کی تاسیس کی بھی اُن میں تعلیم و تدریس کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو پایا۔ اس فقدان کے ازالہ کے لیے توفیقِ ایزدی سے عالمِ ربانی اور حکیمِ روحانی حضرت علامہ سید صفدر حسین نقوی النجفی مرحوم برسرِ میدان اُترے۔ یوں تو سید مرحوم نے ہر حوالے سے خدمتِ قوم کی اور کسی میدان کو اپنے جذبہ و عمل سے خالی نہ چھوڑا لیکن دین کی تبلیغ و ترویج بذریعہ درس و تدریس اور نشر و اشاعت

آپ کا خصوصی شعبہ تھا۔ آپ کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں وطنِ عزیز کے تقریباً ہر بڑے شہر اور ضلع میں ایک نہ ایک مدرسہ کا قیام عمل میں آیا اور یوں آپ نے سیکڑوں مدارس کی تاسیس کر کے مذہب و ملت کی گراں قدر علمی خدمت انجام دی۔

آپ نے مکتبِ آلِ محمدؐ کا تعارف کروانے کے لیے کئی اشاعتی ادارے بھی قائم کیے جنہوں نے سیرتِ معصومینؑ اور افکارِ طاہرینؑ پر صدہا کتب زیورِ اشاعت سے آراستہ کیں۔ آپ نے عربی اور فارسی کتب کے ترجمہ کا رواج ڈالا اور متعدد کتب اپنے قلم سے ترجمہ کیں۔ آپ کی اشاعتی خدمات میں ۲۹ جلدوں پر مشتمل تفسیرِ نمونہ ایک اعلیٰ و ارفع شاہکار ہے جس کا مقابلہ کوئی بھی دوسری تفسیر نہیں کر سکتی اور ہر مکتبِ فکر میں اسے پسندیدگی سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نسلِ جدید بھی اس سے کاملاً استفادہ کرتی ہے۔

علمائے اعلام تو ہر طبقہ میں کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن علمائے ربانی کا ہر دور میں فقدان رہا ہے۔ یعنی علمیت کا اظہار تو بہت سوں نے کیا لیکن دینِ خدا کی سربلندی کے لیے کام کرنے والے بہت کم ہیں۔ دنیاوی جاہ و جلال اور مال و منال کے حصول کے لیے کوشاں رہنا، حکمرانوں کے ایوانوں کا طواف کرنا، درباروں اور سرکاروں میں حاضری دینا تو عام ہے لیکن فقرِ ابوذر کو اپنانا نادر و نایاب۔

علامہ سید صفدر حسین نے اپنی پوری زندگی تقویٰ اور پرہیزگاری میں بسر فرمائی۔ کبھی اقتدار کے ایوانوں میں سر نہ جھکایا اور ہمیشہ خدا پر بھروسہ کیا۔ حکمرانوں نے آپ کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے کئی دفعہ چالیں چلیں اور لالچ دیے لیکن آپ نے یہ کہہ کر کہ "مجھے اپنی قوم پر بھروسا ہے" اُن کی پیش کشوں کو

پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ جب آمر ضیاء الحق نے جامعۃ المنتظر کے لیے ایک خطیر رقم بھیجی تو آپ نے اس تحریر کے ساتھ واپس کر دی کہ ضیاء صاحب! ہمارا مسلک کبھی بھی حکومتوں کے وسائل سے نہیں پنپا بلکہ ہم نے ہمیشہ حزبِ اختلاف کا کردار ادا کیا اور اس کی بھاری قیمت بھی چکائی ہے۔

اس درویش صفت عالمِ ربانی نے کبھی کسی غیر کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ نہ کسی ایرانی، عراقی، لبنانی اور کویتی وغیرہ سے وسائل حاصل کیے بلکہ جب حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید روح اللہ موسوی الخمینی پیرس سے واپس آرہے تھے تو آپ نے اُن سے ملاقات کر کے اُن کی خدمت میں جہاز کے ٹکٹ کا خرچہ پیش کیا جو اُنہوں نے بخوشی قبول فرمایا۔

حضرت علامہ صفدر حسین نجفی کی شرافت، دیانت، امانت اور خودداری نہ صرف عوام بلکہ علمائے اعلام اور مجتہدین کرام میں بھی مشہور تھی۔ عظیم ترین معاصرین آپ کے سیرت و کردار کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ ایران میں ایک دفعہ آیت اللہ العظمیٰ آقائے منتظری نے میرے سامنے آپ کی شرافت کے واقعات بیان فرمائے اور کہا کہ صفدر حسین نجفی ایک عظیم انسان تھے۔ موصوف نے سیکڑوں مساجد، امام بارگاہیں اور مدارس تاسیس کیے لیکن اپنا ذاتی گھر تک نہ بنوایا۔ مومنین نے آپ کو کئی دفعہ نئی گاڑیاں خرید کر پیش کیں لیکن آپ نے انہیں بیچ کر رقم مدارس و مساجد کی تعمیر میں صرف کر دی۔

علامہ سید صفدر حسین کا اندازِ نصیحت و تربیت اس قدر دل نشین تھا کہ آپ اپنے طلبہ اور عقیدت مندوں کی ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے تو انہیں ایک لطف محسوس ہوتا تھا۔

وجہ یہ تھی کہ آپ کے دل کا آئینہ کدورت و نفرت سے منزہ تھا، آپ ہر کسی کی بہتری چاہتے تھے اور ہر کسی کو اپنے سایۂ شفقت سے نوازتے تھے۔ یہاں تک کہ جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا وہ یہ سمجھتا تھا کہ حضرت علامہ کی جو نوازشات میرے ساتھ ہیں ویسی اور کسی کے ساتھ نہیں ہوسکتیں۔ آپ ہر صاحب کمال کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور اس میں اپنے پرائے کی بھی تمیز نہ کرتے تھے۔ آپ کے دل میں کسی کے لیے بغض و کینہ نہ تھا اور فقط کردار و عمل کی صالحیت کو انسانی شرف کا پیمانہ سمجھتے تھے۔ ہمارے استاد علام نے ہزاروں لوگوں کی تربیت کی اور اپنے کردار و عمل کا نمونہ اُن کے سامنے پیش کر کے اُنھیں دعوتِ فکر و عمل دی۔

آپ کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ آپ اپنے عقیدت مندوں کے دلوں میں انقلاب برپا کردیا کرتے تھے۔ جو بھی کسی تنظیم سازی کی بات کرتا آپ اُسے کھلے دل سے قبول کرتے تھے۔ آپ نے قوم کو منظم کرنے والی ہر تنظیم کی دامے درمے قدمے سخنے امداد کی اور ہر ملی خدمت کی تحریک میں استعانت فرمائی۔ جب حضرت علامہ مفتی جعفر حسین قبلہ کی قیادت میں قوم نے منظم ہوکر تحریک چلائی اور آمرِ وقت کو للکارا تو اس تحریک کا پورا خرچہ سید صفدر حسین قبلہ نجفی نے برداشت کیا جس سے وہ آمر شیعہ قوم کی وحدت و یکانگت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگیا۔

آج ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس سید مرحوم اور اُستادِ مغفور کی مجالس علیہ کو مرتب کر کے شائع کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ آپ کی مجالس کا انداز بھی آپ کی شخصیت کی طرح نہایت منفرد تھا۔ آپ کا انداز مجالس تبلیغی اور علمی ہوتا تھا۔ آپ سادہ اور رواں دواں اسلوب میں تقریر فرماتے جس کا اثر سامعین کے دلوں پر ہوتا تھا۔ آپ اپنی واہ واہ ہرگز نہ چاہتے تھے بلکہ فکر و عمل کی ترویج آپ کا مطمح نظر ہوتا

تھا۔ آپ علمی نکات کے بیان اور مصائب پڑھنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کے مصائب میں وہ تاثیر ہوتی تھی کہ در و دیوار گریہ کناں نظر آتے تھے۔ کسی سامع میں یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ خاموشی سے کربلا والوں کے مصائب سنتا رہے اور گریہ نہ کرے، بلکہ عزادار دھاڑیں مار مار کر روتے اور آہ و زاری کرتے تھے۔

آپ کے بعد کسی ذاکر و خطیب اور عالم و واعظ کی منبر پر بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ استادِ معظم کے دل میں قبرِ حسینؑ تھی، آپ کے دل میں کربِ کربلا کا ڈیرہ تھا۔ میری اشک بار آنکھوں نے کئی بار یہ منظر دیکھا کہ آپ مجلس ختم کرنے کے بعد کتنا ہی عرصہ مغموم و محزون رہتے، کسی سے بات نہ کرتے اور مسلسل گریہ کناں رہتے۔ اس اثنا میں دربارِ حسینؑ یعنی مجلس عزا میں موجود سامعین اور ناظرین بھی کافی دیر تک سوگوار رہتے تھے۔

ہائے افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اور یہ عظیم ہستی اپنے ارادت مندوں کو جلد ہی داغِ مفارقت دے گئی۔ قوم اپنے محسن سے محروم بلکہ یتیم ہوگئی۔ اللہ رب العزت ہمارے اس عظیم رہبر و رہنما کو جوارِ معصومینؑ میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کی قبرِ مطہر پہ تا قائمِ قیامت بارانِ رحمت برستی رہے۔

عبدالزہرا
ریاض حسین جعفری
فاضل قم

مجلس اوّل

- جب تک کوئی خاص قرائن موجود نہ ہوں تو ان جملوں کا سارے زمانے کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔
- ازل سے لے کر ابد تک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
- کسی زمانے میں اللہ کے نزدیک دینِ اسلام نہیں تھا۔
- دین خدا کے ہاں نہ کبھی بدلا ہے اور نہ کبھی بدلے گا۔
- ہمیشہ سے دین اسلام تھا، ہے اور رہے گا تو اب دیکھنا یہ ہے کہ دین کیا ہے؟
- وہ راستہ کہ جس پر چل کر اللہ کی عبادت کی جا سکے۔
- قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ مجھ میں ہر چیز کا علم موجود ہے
- جب بزمِ پیغمبرؐ سے اُٹھ کر جاتے تھے تو ایک دوسرے سے یہ پوچھتے تھے کہ رسولؐ ابھی کیا کہہ رہے تھے۔
- تم سب سے زیادہ فیصلہ کرنے والا علیؑ ہے۔

ذکرِ مصائب رہائی از شام

- اے فرزندِ رسولؐ! واقعاً آپؑ کا واقعہ اصحاب کہف سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔
- بے غیرتو! تم کو شرم نہ آئی کہ رسولؐ زادیاں تمہارے شہر میں پھرائی گئیں۔

مجلسِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارشادِ رب العزت ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (سورہ آل عمران، آیہ ۱۹)

"جو یقیناً اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے"۔

آپ حضرات اگر قرآنِ مجید کا اور اس کے تراجم کا مطالعہ کرتے ہیں تو تقریباً اس آیت کا ترجمہ تمام تراجم میں ذکر کیا گیا ہے کہ "دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے"۔

لیکن حقیقت میں یہ اس آیت کا پورا ترجمہ نہیں ہے۔ وہ اس طرح کہ زبان کی جہاں تک کوتاہیاں ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ بہت سے لفظوں کے پورے معنی کو وہ ادا نہیں کر پاتیں۔

عربی زبان کے جملے دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ فقرے ہیں، وہ جملے ہیں کہ جن کا کسی خاص زمانے کے ساتھ تعلق ہے۔ گذشتہ زمانے کے ساتھ، یا موجودہ زمانے کے ساتھ، یا آئندہ زمانے کے ساتھ۔

اور کچھ فقرے اور جملے ایسے ہیں کہ جن کا کسی خاص زمانے کے ساتھ تعلق

نہیں ہے، لہٰذا ایسے فقرے، جب تک کوئی خاص قرائن موجود نہ ہوں تو ان کا سارے زمانوں کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو ایسے جملوں کو جملہ فعلیہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق کسی خاص زمانے کے ساتھ ہوتا ہے۔ گذشتہ زمانے کے ساتھ تعلق ہو تو فعل ماضی ہوگا۔ موجودہ یا آئندہ زمانے کے ساتھ تعلق ہو تو فعل مستقبل یا فعل مضارع ہوگا اور جن جملوں کا کسی خاص زمانے کے ساتھ تعلق نہیں ہوگا اس جملے کو، اس فقرے کو جملہٗ اسمیہ کہتے ہیں۔

اور یہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے اور اس قسم کی سیکڑوں اور آیات بھی ہیں کہ جن کا تعلق کسی خاص زمانے کے ساتھ نہیں مثلاً جیسے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ہے اسی طرح اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (سورۂ فاطر، آیہ ا) کہ "اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

تو ظاہراً اس کا مفہوم یہی ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ گذشتہ زمانے میں یا صرف موجودہ یا آئندہ زمانے میں ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ ہمارے ترجمہ سے یہ مفہوم نکلتا ہے نہ یہ کہ آیت کا یہ ترجمہ ہے۔ تو جس طرح اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ہر زمانے میں قدرت رکھتا ہے یا مثلاً اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (سورۂ بقرہ، آیہ ۲۳۱) "یعنی خدا ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

اصل مفہوم تو اس کا یہ ہے: ازل سے لے کر ابد تک اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ تو جس طرح اس کا یہ مفہوم ہے اسی طریقے سے اس آیت کا مفہوم بھی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس وقت تو اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے اور کسی زمانے میں اللہ کے نزدیک دین اسلام نہیں تھا، یا

بعد میں کوئی ایسا زمانہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ جس میں اللہ کے نزدیک دین اسلام نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں، بلکہ اگر اس کا پورا ترجمہ اور مفہوم بیان کیا جائے تو مفہوم بنے گا کہ "اللہ کے نزدیک دین اسلام تھا، دین اسلام ہے اور دین اسلام رہے گا"۔

اگرچہ مختلف زمانوں کے اور مختلف انبیاءؑ کے پیروکاروں نے اپنے دینوں کے الگ الگ نام رکھ دیے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو یہودی کہتے ہیں۔ گویا ان کو دین یہود مثلاً عیسائی، نصرانی وغیرہ نام رکھ دیے گئے ہیں لیکن یہ اللہ کے دین کے نام نہیں ہیں یہ تو جو دین انہوں نے خود اپنا لیے ہیں۔

"دین خدا کے ہاں نہ کبھی بدلا ہے اور نہ کبھی بدلے گا"۔

جب سے اس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے اس وقت سے لے کر جب تک یہ مخلوق رہے گی اس کے ہاں ایک ہی دین ہے۔ اس کے اصول ایک ہیں اور اس کے اصول کبھی بھی بدلا نہیں کرتے۔ تو جب یہ بات واضح ہے کہ اللہ کے نزدیک ہمیشہ سے دین اسلام تھا، ہے اور رہے گا تو اب دیکھنا یہ ہے کہ دین کیا ہے؟ کسے کہتے ہیں دین؟

تو ایک تو اس کا مفہوم یہ کہ لغوی اور عربی زبان میں دین کسے کہتے ہیں اور دوسرا اس کا مفہوم ہے اصطلاحی؛ وہ یہ کہ دین والوں کے نزدیک دین کسے کہتے ہیں؟

لغت کے اعتبار سے ایک دین کا معنی ہے جزا اور دوسرا معنی ہے حساب، یعنی حساب و کتاب ہے۔

عام طور پر زمانۂ جاہلیت کے عرب جب ان کے ہاں دین نہیں پہنچا تھا، تو

وہ اس کا مفہوم یہی استعمال کرتے ہیں کہ دین کا معنی جزا یا دین کا معنی حساب و کتاب ہے۔

قرآن میں بھی بعض جملوں کا یہی معنی و مفہوم استعمال ہوا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں کہ ''وہ مالک یوم الدین'' ہے، یعنی مالک ہے یوم جزا کا، یا یوم حساب کا، اور مقامات پر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اور اب اہلِ دین کی اصطلاح میں دین کا معنی کیا ہے؟

''وہ راستہ کہ جس پر چل کر اللہ کی عبادت کی جاسکے، اس کو دین کہتے ہیں۔ وہ دین، وہ راستہ، وہ طرزِ عمل جس پر چل کر انسان اللہ کی عبادت کرسکے، وہ دین ہے''۔

ایک بات ذہن میں رکھیے!

کہ خالق کائنات اور انسان کے جو فرق ہیں ان میں سے ایک فرق یہ ہے کہ آپ جب گفتگو کرتے ہیں اور کوئی جملہ استعمال کرتے ہیں تو اس سے بیک وقت ایک ہی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔

یعنی ایک جملہ اگر استعمال کریں، کوئی بھی جملہ ہو تو چونکہ آپ کے تصور میں ایک ہی وقت میں صرف ایک ہی مفہوم آسکتا ہے تو لہٰذا جب کوئی آپ جملہ استعمال کریں گے تو جس کا آپ کے ذہن میں بیک وقت ایک مفہوم آسکتا ہے اسی طرح مخاطب کے ذہن میں بھی بیک وقت ایک ہی مفہوم آسکتا ہے۔

یعنی اس ذہن میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ذہنِ انسانی میں کہ بیک وقت وہ دو چیزوں کا تصور کرسکے۔ تو چونکہ گنجائش نہیں ہے ہمارے اذہان میں، لہٰذا جب ہم کوئی لفظ استعمال کریں گے تو ہماری مراد بھی ایک ہوگی اور سننے والے کے

ذہن میں بھی ایک ہی مفہوم ہوگا۔

بعض اوقات ہوسکتا ہے کہ لفظ کا معنی کوئی اور ہو، اور قرائن سے آپ کچھ اور سمجھانا چاہیں تو وہاں بھی وہ ہی جو کچھ آپ سمجھانا چاہتے ہیں۔ وہ ہی اس کے مفہوم میں ہوگا، مثلاً آپ کہیں کہ وہ شیر آرہا ہے اور ممکن ہے کہ آپ کی مراد اس شیر سے کوئی حیوان نہ ہو، بلکہ کوئی انسان جو شجاع اور بہادر ہے وہ آپ کے ذہن میں ہو تو اس صورت میں یہ مفہوم بھی یکے بعد دیگرے آئیں گے۔ بیک وقت آپ کے ذہن میں نہیں آسکتے۔

تو نفسِ انسانی میں، ذہنِ انسانی میں اور دماغِ انسانی میں بیک وقت ایک ہی مفہوم آسکتا ہے دو نہیں آسکتے۔ انسان بیک وقت ایک ہی طرف توجہ رکھ سکتا ہے دو طرف توجہ نہیں رکھ سکتا، لہٰذا اس کی گفتگو سے، کلام سے بیک وقت کئی مفاہیم نہیں سمجھے جاسکتے۔

تو خالقِ کائنات، چوں کہ (پوری کائنات پر) اس کا علم بھی محیط ہے، اس کی قدرت بھی محیط ہے تو اس کے کلام میں اتنی وسعت ہے کہ اس کے کلام میں بیک وقت کئی مفاہیم مراد ہوسکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ارشادات ائمہ علیہم السلام اور ارشادات سرکار رسالتؐ میں یہ کہا گیا ہے کہ قرآنِ مجید کا ایک ظاہر ہے اور پھر اس ظاہر کا بھی ایک ظاہر ہے۔ اور اسی طرح اس کا ایک باطن ہے اور پھر اس کے باطن کا بھی ایک باطن ہے۔ اور بعض اوقات سات باطن ہوتے ہیں اور ۷۰ باطن ہوتے ہیں اور بعض روایات میں تو ۷۰ ہزار باطن کے پائے جانے کا پتا چلتا ہے۔

اور ساتھ یہی مراد ہے اس روایت سے کہ جب ابن عباسؓ نے یہ بیان کیا کہ میں جناب امیرالمومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ ساری رات "بسم اللہ

الرحمٰن الرحیم" کی تفسیر بیان کرتے رہے۔ رات ختم ہوگئی لیکن بسم اللہ کی تفسیر ختم نہ ہوئی۔ اور مولاؑ نے فرمایا:

اے ابن عباسؓ! اگر یہ رات طویل ہوتی تو میں اس کی اتنی تفسیر بیان کرتا کہ ۷۰ اُونٹ کا بار کتابیں بن جاتیں:۔

(نعرۂ حیدری)

تو لہٰذا قرآن کی یہ خوبی ہے کہ اس کی ایک ایک آیت سے بہت سے مفاہیم مراد ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قرآن چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) آیات پر مشتمل ہے اور اس قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ مجھ میں ہر چیز کا علم موجود ہے۔

مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (سورۂ انعام، آیہ ۳۸)

"ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا"۔

یا دوسری آیت کہ:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (سورۂ انعام، آیہ ۳۸)

"تو کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کتاب میں موجود نہ ہو"۔

یا ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (سورۂ نحل، آیہ ۸۹)

"یہ قرآن ہر چیز کا واضح بیان ہے"۔

تو کافی اس طرح کی آیات جن کو اس قسم کے مفہوم کو بتانے کی کسی قسم کی الجھن نہیں ہے۔

جب قرآن یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہر چیز کا علم اس میں موجود ہے جب کہ عموماً کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں قرآن میں سے ہر چیز کو ثابت کر سکتا ہوں، حتیٰ کہ مثلاً یہی نماز جس کی یہ کیفیت کہ تکبیرۃ الاحرام سے شروع ہوتی ہے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پر ختم ہوتی ہے۔

تو اگر پیغمبرؐ اسلام کا اور آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام کے بیانات نہ ہوتے تو جو اہم ترین چیز ہے نماز، جس کا تذکرہ ایک ہزار سے زیادہ مرتبہ قرآنِ مجید میں کیا گیا ہے، تو اس کی ترتیب ہماری سمجھ میں نہ آتی، اگر وہ پڑھ کر نہ دکھاتے۔

تو اب دعویٰ اس قرآن کا یہ ہے کہ ہر چیز مجھ میں موجود ہے تو اسی صورت میں موجود ہو سکتی ہے کہ اس مختصر سے مفاہیم کو اس طریقے سے بیان کیا ہے۔ اب اس کی کیفیت کیا ہے؟ اب ظاہر ہے کہ نہ ہم اتنا علم رکھتے ہیں نہ اس کو بیان کر سکتے ہیں۔ یہ تو وہی سمجھ سکتا ہے اور بتا سکتا ہے کہ جو واقعاً وارثِ علمِ کتاب ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ان سے سوالات کیے جاتے تھے کہ یہ چیز قرآن میں کہاں ہے تو وہ بتا دیتے تھے۔

اب جس وقت قرآن نے یہ دعویٰ کیا کہ مجھ میں ہر چیز کا علم ہے تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہم بھی ہر چیز کو قرآن سے سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا اشتباہ یہاں سے ہوا، لیکن خود قرآن یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ زبان سمجھتے ہیں مثلاً آج سے پچاس سال پہلے جو اردو زبان تھی آج وہ زبان نہیں ہے۔ اسی طرح سو سال پہلے جو تھی وہ اور تھی۔

تو اس طریقے سے عربی زبان کا بھی یہی عالم ہے کہ ہر زمانے میں ہر زبان میں تغیرات آتے رہتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ جب تیس سال، پچاس سال،

سو سال میں زبان بدلتی رہتی ہے تو جب صدیاں بیت جائیں تو پھر تو کتنا فرق آجائے گا۔ تو اب وہ زبان جو چودہ سو سال پہلے تھی اس کے مفاہیم الگ تھے۔ اس کے الفاظ الگ تھے، اور آج جو عربی بولی جاتی ہے اس میں اور اُس میں اگر آپ لوگ اور خصوصاً جو لوگ عربستان میں رہتے ہیں وہ دیکھیں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اب قرآن یہ بتاتا ہے کہ جن کی زبان میں قرآن اُترا تھا، جو خالصتاً عرب تھے اور جن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم عرب العرباء ہیں یعنی عربیوں کے عرب ہیں تو اب وہ جو اس زمانے میں تھے کہ جب قرآن نازل ہو رہا تھا، اور وہ لوگ تھے ہی وہ کہ جن کے لہجے میں قرآن نازل ہو رہا تھا، اس کے متعلق خود قرآن یہ کہتا ہے کہ جب بزمِ پیغمبرؐ سے وہ اُٹھ کر جاتے تھے تو ایک دوسرے سے یہ پوچھتے تھے کہ رسولؐ ابھی کیا کہہ رہے تھے۔

تو جب ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حضورؐ کیا کہہ رہے ہیں تو اس میں سے سمجھنا تو بعد کی بات ہے۔ تو اسی لیے قرآنِ مجید نے اپنی مختلف آیات میں خود یہ توضیح کی ہے کہ قرآن بذاتہٖ کافی نہیں ہے بلکہ جہاں کم از کم چار آیاتِ قرآنی ایسی ہیں کہ جن میں پیغمبرؐ اسلام کی بعثت کے سبب کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تو ان میں اگرچہ الفاظ کی تقدیم و تاخیر ہے، لیکن مفہوم ایک ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ○ (سورۂ جمعہ، آیہ ۲)

"کہ خدا وہ ہے کہ جس نے مکہ والوں میں ایک رسولؐ بھیجا، اس کا کام کیا ہے؟ وہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتا ہے، دوسرا کام کیا ہے؟ وہ ان کے نفسوں کو پاک کرتا ہے اور تیسرا اور چوتھا کام کیا ہے؟ انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

تو اگر اہلِ ایمان کے لیے اہلِ زبان ہونا قرآن فہمی کے لیے کافی ہوتا تو پھر يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ کافی ہوتا۔ وہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتا ہے تو وہ جب تلاوت کرتا ہے تو اس وقت سمجھ جائیں لیکن خدا یہ کہہ رہا ہے کہ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ "اب اس کتاب کے بعد کوئی اور کتاب نہیں ہے"۔

یہی کتاب ہے جسے آپ بچوں کو پہلے قرآن پڑھاتے ہیں کہ وہ پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ پھر دوسری منزل یہ ہوتی ہے کہ جب ان میں استعداد پیدا ہوجاتی ہے قرآن فہمی کی، تو آپ قرآن کی تعلیم دیتے ہیں۔

تو اسی طریقہ سے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ پیغمبرؐ کا کام کیا ہے کہ پہلے وہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ پھر ان کے نفسوں کو پاک کرتا ہے۔ جب پاک ہوجاتے ہیں ان کے نفس تو پھر ان کو تعلیم دیتا ہے۔

تو گویا تعلیم کی منزل تیسری منزل ہے تو جب پیغمبرؐ کے زمانے میں قرآن نازل ہو رہا تھا، جن لوگوں کے سامنے قرآن نازل ہو رہا تھا، جب قرآن ان کے لیے کافی نہیں تھا تو آج کے زمانے کا کوئی انسان یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ قرآن کافی ہے اور جو لوگ عربی جانتے ہی نہیں جنھوں نے صرف تراجم سے مدد لینا سیکھا ہے وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو سمجھ لیا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ ایک بزرگ نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر کہہ تو دیا تھا کہ قرآن کافی ہے لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد انہی بزرگ کی زبان سے سنا گیا کہ اگر یہ شخص نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا۔ (نعرۂ حیدری)

تو بہرحال ــــــ!

قرآنِ مجید یقیناً جامع کتاب ہے، اور یہ بھی ہے کہ اگر کوئی کتاب کسی فن سے تعلق رکھتی ہے اور اس فن کی تعلیم اس استاد سے حاصل نہ کروں کہ جو اس فن سے تعلق رکھتا ہے اس وقت وہ کتاب میرے لیے کافی نہیں ہے۔ اب ایک کتاب ایسی ہو کہ جس کا دو فنوں کے ساتھ تعلق ہے تو اس کا حل بھی بہت زیادہ مشکل ہو جائے گا۔

اب ایک کتاب وہ ہے کہ جو کہتی ہے کہ ہر چیز کا علم مجھ میں موجود ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی موضوع و مفہوم ایسا نہیں ہے کہ جس کا تذکرہ اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ تو اب جب تک کوئی شخص اس سے علم حاصل نہ کرے کہ جس کا علم تمام چیزوں پر احاطہ رکھتا ہے اور کسی کا تعلق اس ذات کے ساتھ نہ ہو، تو اس وقت تک وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اس قرآن کو سمجھ گیا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے اُمت اسلامیہ کا کہ منجملہ کمالاتِ جنابِ امیرؑ کے ایک یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے"

یا ارشاد فرمایا:

اَقْضَاكُمْ عَلِيٌّ

"تم سب سے زیادہ فیصلہ کرنے والا علیؑ ہے"۔

یا جناب ابن عباسؓ کا یہ کہنا کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے علم کی حیثیت علیؑ کے مقابلے میں کیسی ہے؟

یہ ابن عباسؓ وہ ہیں کہ جن کو اُمت اسلامیہ میں (واحد شخص ہے ابن عباسؓ) کہ جس کو حبرِ اُمت کا خطاب دیا گیا ہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ یہودیوں کے علماء کو احبار کہا جاتا ہے۔ احبار بمعنی علماء۔ اور حبر کا معنی عالم۔ تو تمام اصحاب پیغمبرؐ میں سے واحد شخص ہیں ابن عباسؓ جن کو اُمت اسلامیہ کے سب سے بڑے عالم کا خطاب دیا گیا ہے۔

ان کا یہ دعویٰ تھا کہ اگر میرے اُونٹ کی مہار جنگل میں کہیں گم ہو جائے تو قرآن سے میں معلوم کرسکتا ہوں کہ میرے اُونٹ کی مہار کہاں ہے؟ وہ اتنا بڑا عالم کہ جس کو اپنے علم پر اتنا ناز تھا۔ جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ تمہارے علم کی نسبت علیؑ کے علم کے ساتھ کیسی ہے؟

تو ابن عباسؓ یہ کہتا ہے کہ میرے علم اور تمام اصحاب کے علم کی علیؑ کے علم کے ساتھ وہی نسبت ہے جو ایک قطرے کو سات سمندروں کے ساتھ ہوتی ہے۔

(نعرۂ حیدری)

تو بہرحال ــــــ!

قرآن جو چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) آیات پر مشتمل ہے اس کا یہ دعویٰ ہے کہ مجھ میں ہر چیز کا علم موجود ہے۔ ظاہراً قرآن کے حجم سے ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگر روایات، احادیث پیغمبرؐ اور ارشاداتِ آئمہؑ کو سامنے رکھا جائے تو وہ یہ بتاتے ہیں جو ایک ایک آیت آپ کو نظر آتی ہے۔ نا معلوم کہ ہر ایک آیت

میں کتنے کتنے علوم و مطالب سمو دیے گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ کچھ ذواتِ مقدسہ خالقِ کائنات نے پیدا کیے ہیں کہ جن کا سرنامہ خود سرکارِ رسالتؐ ہیں اور اس کے بعد وہ ہے کہ جس کے متعلق خود سرکارِ رسالتؐ نے فرمایا:

عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِیٍّ

"علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ"۔

یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

ایک اور حدیث میں تو پیغمبرؐ نے تو اس سے بھی بڑھ کر ارشاد فرمایا:

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم ان سے تمسک رکھو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے" اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

لَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ

"کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی حتیٰ کہ کوثر کے کنارے مجھ تک پہنچ جائیں"۔

تو پیغمبرؐ اسلام نے اشارہ کیا کہ ان میں کبھی جدائی نہیں ہو گی، یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہیں گی۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ سر اور جسم میں جدائی ہو سکتی ہے مگر ان میں جدائی نہیں ہو سکتی۔ اب یہ دعویٰ تھا پیغمبرؐ اسلام کا کہ شاید دنیا کلمہ پڑھنے کی بنا پر، مسلمان ہونے کے لحاظ سے تو اس کو تسلیم کرتی رہتی لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی معاملہ مشاہدہ میں نہ آجائے، اس وقت تک کوئی شخص دل سے، اطمینان سے قبول نہیں کرتا۔

تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ بیتؑ اور قرآن کسی

حالت میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔

ذکرِ مصائب: رہائی از شام

اگر واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو شاید یہ دعویٰ ہی رہتا۔ اس کا کوئی ثبوت خارج میں کوئی موجود نہ ہوتا۔ لیکن واقعۂ کربلا نے تصدیق کی کہ ان کا سر تو نوکِ نیزہ پر بلند ہوسکتا ہے لیکن یہ قرآن سے جدا نہیں ہوسکتے۔

زید بن ارقم صحابیِ رسولؐ ہیں، کوفہ میں رہتے تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے بالاخانے پر بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کر رہا تھا کہ اچانک میرے گھر کی اس کھڑکی سے ایک نورانیت والی روشنی میرے کمرے میں آنے لگی، روشنی آئی تو اس کے تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ اُوپر سے قرآن پڑھ رہا ہے: جس کے الفاظ یہ تھے:

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ (سورۂ کہف، آیہ۹)

''کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ غار اور کتبہ والے ہماری نشانیوں سے کچھ زیادہ عجیب ہیں''۔

سورۂ کہف کی تلاوت کر رہا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں حیران ہوا اور میں نے کہا کہ یہ کون ہے کہ جو میرے بالاخانے سے تلاوتِ قرآن کر رہا ہے۔

کہتا ہے کہ میں نے اپنا سر نکال کر کھڑکی سے جب دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سر ہے جو نوکِ نیزہ پر بلند ہے اور وہ اس آیت کی تلاوت کر رہا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ میں نے پہچان لیا کہ یہ سر کس کا ہے؟

میں نے کہا کہ واقعاً اے فرزندِ رسولؐ! آپ کا واقعہ اصحابِ کہف سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

ایک تو یہ موقع ہے کہ آپ کے مولاؑ نے قرآن پڑھ کر سنایا اور ایک وہ موقع ہے کہ جب سرِ حسینؑ یزید کے سامنے رکھا ہوا ہے اور اس لعین کے ہاتھ میں ایک چھڑی ہے اور اس سے وہ لعین سرِ حسینؑ کی بے حرمتی کر رہا ہے۔ وہاں بھی ایک صحابیٔ رسولؐ بیٹھا ہوا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ یزید بار بار امام حسینؑ کے لب ہائے مبارک پر چھڑی لگاتا ہے تو وہ صحابیٔ رسولؐ برداشت نہ کر سکے اور فرمایا:

اے یزید اپنی چھڑی منہ سے ہٹالے، میں نے اپنی آنکھوں سے بارہا دیکھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ ان لبوں کو چومتے تھے۔

اور بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یزید کی بے ادبی پر سرِ حسینؑ نے قرآن پڑھا:

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ○

"عنقریب ظالموں کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی بازگشت کس طرف ہے"۔ (سورۂ شعراء، آیہ ۲۲۷)

تو بہر حال ـــــ!

واقعۂ کربلا نے ثابت کر دکھایا کہ یہ وہ ہستیاں ہیں کہ نہ جن سے قرآن جدا ہو سکتا ہے اور نہ یہ قرآن سے جدا ہو سکتے ہیں۔

عزادارو ـــــ!

چند واقعات ہیں یا پھر حسینؑ نے قرآن پڑھا یا کلام کیا۔ ان واقعات میں ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص جس کا نام عبداللہ بن عطا ہے، وہ بیان کرتا ہے کہ ایک

رات میں زانوؤں پہ سر رکھ کر سویا ہوا تھا کہ آدھی رات کے وقت زندان سے بیبیوں اور بچوں کے رونے کی آواز بلند ہوئی اور گریہ بڑھتا گیا۔ جب گریہ زیادہ بڑھا تو ایک جگہ جہاں سرِ حسینؑ رومال سے ڈھکا ہوا تھا، ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ رومال ہٹا اور سرِ حسینؑ بلند ہونا شروع ہوا، اتنا بلند ہوا کہ چھت کے قریب پہنچ گیا۔ چھت سے سرِ حسینؑ زندان کی طرف بڑھا اور حسینؑ کے خشک ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی اور یہ لفظ ان خشک ہونٹوں سے ادا ہوئے:

"اے بہن! میری بیٹی کو سنبھالو"۔

اور اس کے بعد سرِ حسینؑ یزید کی طرف متوجہ ہوا، کہنے لگا: اے یزید! تو آرام سے سویا ہوا ہے لیکن اس آدھی رات کے وقت میرے چھوٹے چھوٹے بچے رو رہے ہیں۔ تو وہ لعین گھبرا کے اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ ذرا زندان میں پتہ تو کرو کہ بات کیا ہے؟ بچے کیوں رو رہے ہیں؟

وہ عبداللہ بیان کرتا ہے کہ جب میں قید خانے کے دروازے پر گیا تو میں نے پوچھا کہ اس رات کے اندھیرے میں جب ساری دنیا سوئی ہے، ساری د آرام کر رہی ہے تو یہ قیدی کیوں رو رہے ہیں؟

تو جواب ملا کہ حسینؑ کی ایک چھوٹی سی بچی ہے جس نے عالمِ خواب میں اپنے باپ کو دیکھا ہے۔ اسی لیے یزید نے رہائی دے دی تھی کہ جب سید سجادؑ جناب زینبؑ کے خطبوں سے لوگوں کی آنکھیں کھلیں کہ یہ جن کا تماشا ہم دیکھا یہ تو رسولؐ کا خاندان ہے، یہ رسولؐ زادیاں ہیں اور پتہ چلا کہ یہ خارجی نہیں تھا یہ تو رسولؐ کا نواسہ تھا۔ وہ جو زبانِ رسالت چوس چوس کر پلا تھا۔ جب یہ

چلا تو جو لوگ یزید کے دربار سے اُٹھ کر اپنے گھروں میں جاتے تھے تو ان کی بیویاں، ان کی بہنیں، ان کی مائیں، ان سے کہتی تھیں:

بے غیرتو! تم کو شرم نہیں آئی کہ رسولؐ زادیاں تمہارے شہر میں پھرائی گئیں۔

یزید گھبرا گیا اور سید سجادؑ کو بلایا اور جب آپ تشریف لے آئے تو کہنے لگا کہ آپ کی قید میں نے ختم کر دی۔ اب آپ کا دل چاہے شام میں رہیں، چاہے مدینے میں۔

اب ظاہر ہے کہ سید سجادؑ کو اختیار تھا لیکن کہا کہ اس کا اختیار میری پھوپھی کو ہے۔ چناں چہ

عزادارو ـــــ!

لوہار منگوائے گئے اور امامؑ کی زنجیریں کاٹی گئیں اور پہلا موقع تھا کہ جب سید سجادؑ تنہا دربار میں گئے تھے حالانکہ جنابِ زینبؑ سید سجادؑ کو تنہا نہیں جانے دیتی تھیں، نہ جانے زندان کے دروازے پر اُس وقت جنابِ زینبؑ کی کیا حالت ہوگی۔

جب پلٹ کر آئے تو دیکھا کہ زنجیر آپ کے ہاتھوں اور پاؤں میں نہیں ہیں۔

کہا: بیٹا! یزید نے کیوں بلایا تھا؟

عرض کیا: پھوپھی اماں وہ کہتا ہے کہ آپ کی قید ختم کر دی گئی ہے اور آپ کو اختیار ہے کہ چاہے آپ شام میں رہیں، چاہے مدینہ جائیں۔

بی بیؑ نے کہا کہ اگر مجھے اختیار ہے تو پھر یزید سے کہو کہ ہمیں ایک مکان خالی کرا دے۔ اور جو کوئی ہمیں پُرسہ دینے آنا چاہے تو اس کی اجازت ہو۔ منادی

کرا دی جائے کہ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب سے میرا ماں جایا مارا گیا ہے میں حسینؑ کو رو بھی نہیں سکی، ان کا ماتم بھی نہیں کر سکی، لہٰذا مجھے اجازت دی جائے۔

عزادارو ــــــ!

کئی دنوں تک شام کی عورتیں آتی رہیں اور ان مجالس کی ذاکرہ جناب زینب تھیں یا جناب رباب تھیں یا اُم کلثوم تھیں یا اور بیبیاں تھیں۔

اور جب آخری دن آیا تو ثانی زہراؑ نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اے بیبیو! تم نے بڑا احسان کیا۔ اب علیؑ کی بیٹی تم سے ایک سوال کرتی ہے۔

انہوں نے کہا کہ بی بی ارشاد فرمایئے۔

بی بیؑ نے فرمایا کہ میں اپنے بھائی کی ایک چھوٹی سی امانت تمہارے شہر میں چھوڑے جا رہی ہوں۔ کبھی وقت ملے تو اس کی قبر پہ آ کر چراغ جلا دینا۔

●......●......●

مجلس دوم

- اصول وہ ہیں جن کا تعلق انسان کے عقیدے کے ساتھ ہے اور فروعات وہ ہیں کہ جن کا تعلق انسان کے عمل کے ساتھ ہے۔
- اصول دین میں چوں و چرا کی جاسکتی ہے مگر فروعِ دین میں یہ ہے کہ یا انسان خود مجتہد بنے یا تقلید کرے۔
- جن مسائل کا علم نہیں ہے اُن کے بارے میں صاحبانِ علم کی طرف رجوع کرو۔
- دین کی پہلی بنیاد، پہلی جڑ خدا کی معرفت ہے۔
- ایک خود اپنے اندر غور وفکر کرو اور ایک اپنے گردوپیش پر غور وفکر کرو۔
- اس نے جس کو بھی اپنی تخلیق کا شاہکار بنایا اس کا جواب نہیں۔
- اے انسان تو خیال کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے تجھ میں سارا عالم سمو دیا گیا ہے۔
- کوئی عالم وقادر ذات ہے کہ جس نے اس کائنات کو خلق کیا ہے۔
- وہ فطرتاً توحید کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے، ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔

ذکرِ مصائب: شہادت حبیب ابن مظاہرؓ

- حسینؑ کا عمل، حسینؑ کا کردار، حسینؑ کے ارشادات یزید کو چبھتے تھے۔

مجلسِ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارشادِ رب العزت ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (سورہ آل عمران، آیہ ۱۹)

"یقیناً دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے"۔

عرض کیا ہے کہ لفظ دین میں خود وجودِ پروردگار اور اس کے جتنے لوازمات ہیں، ان کا ایک اجمالی ذکر موجود ہے۔ اور دین مجموعہ ہے اصول اور فروع کا، اصول وہ ہیں کہ جن کا تعلق انسان کے عقیدے کے ساتھ ہے اور فردعات وہ ہیں کہ جن کا تعلق انسان کے عمل کے ساتھ ہے۔ اصول مضبوط ہوئے تو عمل میں بھی اضافہ ہوا۔

لہٰذا پہلی منزل یہ ہے کہ انسان اصولِ دین کے بارے میں پختہ یقین رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اصول میں تقلید نہیں ہے کیوں کہ تقلید کا معنی تو ہوتا ہے کہ کسی کے قول کو بے دلیل پوچھے بغیر مانا جائے۔ لیکن یعنی فروعِ دین میں چون و چرا نہیں ہے۔ اگر انسان فروعِ دین کو کسی کے کہنے سے تسلیم نہیں کرنا چاہتا تو پھر اسے خود مجتہد بننا چاہیے۔

اگر اس کو اچھا نہیں لگتا کہ کوئی اس کو بتائے کہ نماز اس طرح پڑھنی ہے، روزہ اس طرح رکھنا ہے۔ خمس اس طرح دینا ہے، زکوٰۃ اس طرح دینی ہے تو پھر وہ خود مجتہد بنے لیکن اصولِ دین میں چون و چرا کی گنجائش ہے وہاں یہ نہیں ہے کہ آنکھ بند کر کے کسی بات کو مان لیا جائے۔

ماں باپ کہیں کہ خدا ہے تو ہے، اگر ماں باپ کہیں کہ کسی کو رسول مان لو تو اس کو مان لو۔ نہیں وہاں یہ ہے کہ تحقیق کر کے مان لو۔ دل مانتا ہے تو مانے، نہیں مانتا تو نہ مانے۔ البتہ یہ ہے کہ دین و دیانت کے ساتھ غور و فکر کرے۔ یہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ہی نہ مانے۔ اگر واقعاً یقینی ادلہ کسی مطلب کی موجود ہیں تو پھر اس کو انسان تسلیم کرے۔

لیکن بہرحال ـــــ!

میں نے عرض کیا کہ اصولِ دین میں چون و چرا کی جا سکتی ہے فروعِ دین میں یہ ہے کہ یا تو انسان خود مجتہد بنے، احتیاط پر عمل کرے اور یا کسی مجتہد کی تقلید کرے۔ جیسے کہ اور مسائل میں۔ جیسے کہ ایک شخص علاج کرانا چاہتا ہے تو وہاں بھی یہی صورت ہے کہ یا تو وہ خود ڈاکٹر بنے اور اپنا علاج کرے اور اگر وہ خود ڈاکٹر نہیں بن سکتا تو ظاہر ہے کہ کسی ڈاکٹر کی طرف رجوع کرے گا۔

یہی صورت باقی قوانین کی ہے۔ آپ جس فن میں مہارت خود نہیں رکھتے تو ظاہر ہے کہ مجبور ہیں کہ اس فن کے کسی ماہر کی طرف رجوع کریں۔

اسی طریقہ سے فقہ اور فروعی مسائل میں جو لوگ خود درجہ اجتہاد پر فائز نہیں ہیں، عقل بھی یہی کہتی ہے، دین بھی یہی کہتا ہے اور قرآن اور احادیث بھی یہی کہتے ہیں کہ جن مسائل کا تمہیں علم نہیں ہے تو ان کی طرف رجوع کرو جو صاحبانِ

علم ہیں۔

لیکن عرض کیا کہ وہاں یقین پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً آپ ایک ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں اور آپ بیمار ہیں تو وہ ایک دوا تجویز کرتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ آپ کو علم پیدا ہو، یقین پیدا ہو بلکہ اس بنا پر کہ وہ اہلِ فن ہے۔

لیکن اگر ایک آدمی اس سے تعلق نہیں رکھتا اور کہے کہ یہ دوا لو تو ظاہر ہے کہ آپ نہیں لیں گے۔

پس یہی صورت ہمارے ہاں ہوتی ہے کہ ہم لوگ مسائلِ دین سے واقف نہیں ہوتے۔ کوئی بھی مولوی مل گیا، اُلٹا سیدھا تو جو اس نے کہہ دیا وہ مان لیا۔ نہیں، بلکہ اس علم فقہ کے جو ماہرین ہیں جب ان کا کسی مسئلہ میں نظریہ ہو، تب تک انسان کا عمل عقلی طور پر، شرعی طور پر کسی طریقے سے بھی صحیح نہیں ہوتا۔

کیوں کہ اصولِ دین ہوں یا فروعِ دین ہوں، سب کی بنیاد مسئلہ توحید پر ہے۔ نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعرِفَتُہٗ

"دین کی پہلی بنیاد، پہلی جز ہے خدا کی معرفت"۔

جتنے انبیاءؑ آئے، مرسلین آئے، آئمہؑ آئے جتنا زور انہوں نے قولی، عملی، ہر لحاظ سے توحید پر دیا ہے اتنا کسی اور پر نہیں دیا۔ اگر نہج البلاغہ کے خطبات پڑھیں تو ۹۰ فی صد خطبات امیرالمومنینؑ کے توحید کے اُوپر ہیں۔ یہی صورت قرآنِ مجید کی ہے۔ یہی صورت صحیفہ سجادیہ کی ہے۔ یہی صورت ائمہؑ اہلِ بیتؑ کے اور جو مجموعے احادیث کے ہیں، سب سے زور، سب سے تاکید ان میں اسی

مسئلہ توحید پر ہے۔ اس لیے کہ یہ بنیاد ہے۔ یہ مسئلہ صحیح ہے تو باقی صحیح ہیں۔ جس کی اوّل ہی غلط ہو تو آخر بھی غلط ہی ہوتا ہے۔

اب یہ کہ یہ یقین پیدا کیسے ہو؟ آخر کسی چیز کا یقین پیدا کرنے کے لیے اسباب چاہئیں۔ تو اس کے اسباب کی طرف قرآن مجید میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے اور ان اسباب کو دو چیزوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک خود اپنے اندر غور و فکر کرو اور ایک اپنے گرد و پیش پر غور و فکر کرو۔

کوئی کاریگر کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، آپ دیکھتے ہیں عموماً ان کی صنعت کے شاہکار بدلتے رہتے ہیں۔ ایک سال ایک ماڈل ہوتا ہے اور دوسرے سال وہ ماڈل بدل جاتا ہے۔ دوسرا ماڈل آجاتا ہے۔ آخر اس میں اور اُس میں کوئی کمی زیادتی ہوتی ہے تو تبھی یہ ماڈل بدلا ہے۔ اگر بعینہٖ ہے تو پھر وہی شاہکار رہتا۔ دوسری چیز کو شاہکار کیوں بنایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی نقص تھا۔

تو اب نقص کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں: ایک علم کی کمی اور دوسرا قدرت کی کمی۔ بعض لوگوں کو تو پتہ ہی نہیں ہوتا یہ نقص ہے یا نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ نہیں اس میں یہ نقص رہ گیا اور بعض اوقات یہ پتہ ہوتا ہے کہ یہ نقص ہے لیکن ان میں توانائی کی قدرت نہیں ہوتی۔ جن کی بنا پر وہ اس نقص کو دُور کرسکیں۔ کچھ عرصے کے بعد اس میں وہ توانائی، قدرت آجاتی ہے جس سے ان نقائص کو وہ دُور کر دیتا ہے لیکن اگر کوئی ایسی ذات ہو جس کے نہ علم میں کمی ہو، نہ قدرت میں کمی ہو، اس کا علم بھی لامتناہی ہو اور اس کی قدرت بھی لامتناہی ہو، تو پھر اس کے شاہکار نہیں بدلا کرتے۔

اس نے جس کو بھی اپنی تخلیق کا شاہکار بنایا اس کا جواب نہیں تھا۔ ایک تو وہ ہے کہ جس کو اول مخلوق قرار دیا اور جتنے کمالات ان کے ظرف میں سموئے جاسکتے تھے اس نے سمو دیئے۔ اب اس کے بعد اس کا کوئی ثانی پیدا نہ ہوسکا۔ اور ایک عام مخلوقات میں سے انسان کو اس نے اشرف المخلوقات قرار دیا۔ ویسے تو اس کی جس جس مخلوق کو آپ الگ الگ دیکھیں تو وہ ہر ایک اپنی صنف کے اعتبار سے اس کا شاہکار ہے۔ لیکن ان کروڑھا، ارب ھا، کھرب ہا مخلوق میں سے اشرف ترین مخلوق اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس ایک شکل و شباہت، ایک ڈھانچہ دنیا کے سامنے اس نے پیش کیا۔ کروڑھا سال گزر گئے آج تک کسی میں یہ جرأت پیدا نہیں ہوسکی کہ وہ کہے کہ اس کی آنکھیں یہاں ٹھیک نہیں ہیں یہاں ہونی چاہیے۔ ہاتھ یہاں درست نہیں ہیں۔ پاؤں کی جگہ پر ہاتھ ہونے چاہئیں۔ نہیں، بلکہ جہاں جہاں جس جس عضو کو اس نے فِٹ کر دیا مجال نہیں ہے کہ اس میں کوئی نقص نکال لے اور کہہ سکے کہ یہ ہے۔

اور جتنی اس جسم کو اپنی بقا کے لیے جتنے اعضا کی ضرورت ہوسکتی تھی وہ سب کے سب اس میں پیدا کر دیئے۔ اب ان کی تفصیلات کیا ہیں۔ تو اگر آپ ماہر ہیں تو دیکھتے جایئے کہ کتنے کارخانے ہیں کہ جو سر سے لے کر پاؤں تک کام کر رہے ہیں اور اس لیے سید الموحدین امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

أَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ ، وَفِيْكَ انطوىٰ العَالَمُ الأَكْبَر

"اے انسان تو خیال کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے تجھ میں تو سارا عالم سمو دیا گیا ہے"۔

جو کچھ پوری کائنات میں الگ الگ موجود ہے۔ وہ سب کچھ انسان کے

اندر سمو دیا گیا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ جب سے انسانیت عالمِ وجود میں آئی تو انسان کے اعضاء و جوارح پر ریسرچ شروع ہے اور اس میں جو جو خوبیاں، جو جو کمالات اور جو جو اجزاء پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ عقلِ انسانی دنگ ہو کر رہ جاتی ہے کہ اس نے کس طرح پیدا کر دیا۔

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ یہ انسان، عجیب الخلقت ہے۔ یہ چربی سے دیکھتا ہے، چربی ایک سخت سی چیز ہے۔ اس میں ثقل موجود ہے، اصولی طور پر اس سے نظر تو نہیں آنا چاہیے لیکن اس نے اس قسم کے اجزاء خلق فرمائے ہیں جس سے انسان دیکھتا ہے۔ کان ہے عجیب سے بنے ہوئے ہیں اس سے وہ سنتا ہے۔ زبان اس سے وہ بولتا ہے۔ اسی طریقہ سے اعضاء و جوارح۔ آج تک انسانی عقل دنگ ہے کہ خالق کائنات نے یہ کس قسم کی عجیب مخلوق پیدا کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے آسمان و زمین پیدا کیے۔ اس نے بحار پیدا کیے لیکن کسی کی خلقت میں اس نے یہ نہیں کہا:

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (سورۂ مومنون، آیہ ۱۶)

مگر جب انسان کو پیدا کیا تو یہی الفاظ فرمائے: ''کہ خدا سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے''۔

تو بہرحال ــــــ!

ایک تو یہ ہے کہ انسان اپنی خلقت پر غور و فکر کرے اور دوسرا اس کائنات میں بکھری ہوئی چیزوں میں جتنا غور و فکر کرتا چلا جائے، جتنا سوچتا چلا جائے، جس جس چیز پر غور و فکر کرے تو انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسی عالم و قادر ذات ہے کہ جس نے اس کائنات کو خلق کیا ہے۔

اگر آپ ایک بچے کو بھی یہ سمجھانا چاہیں کہ یہ سب اجزاء خود بخود بن گئے ہیں تو وہ بھی تسلیم نہیں کرے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ ہم جب سے پیدا ہوئے، ہم نے اس مخلوق کو بنا بنایا دیکھا۔ لہٰذا اس سے ہم مانوس ہو گئے۔ اس کی خوبیوں میں کبھی ہمیں سوچنے کا وقت نہیں ملا۔ واللہ! اگر کسی وقت عقلِ انسانی کو الگ رکھا جاتا اور اس کے سامنے اچانک کسی انسان کو پیش کیا جاتا تو تب آپ دیکھتے کہ وہ کتنا حیران و پریشان ہوتا کہ یہ کتنی عجیب خلق ہے۔

تو اسی طریقے سے میرے محترم! خدا فرماتا ہے:

إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ (البقرہ، آیہ ۱۶۴)

"آسمانوں، زمینوں، رات دن کے آنے، دریاؤں کے چلنے، کشتیوں کے پھرنے، اشجار و احجار و کائنات کی ہر ہر چیز میں وہ کہتا ہے کہ میری نشانیاں موجود ہیں"۔

جس چیز کو بھی آپ اپنے سامنے رکھ لیجیے اور غور کیجیے تو آپ کو ہزارہا نشانیاں اس کے وجود کی مل جائیں گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ انسان ان میں غور و فکر کرنے کی کوشش کرے۔

نیوٹن جو منکرِ خدا تھا وہ کہتا ہے کہ میں نے خدا کو چند چیزوں سے پہچانا ہے۔ ایک یہ کہ اس فضاء میں کروڑھا ذرّے موجود ہیں اور ان میں ہر ذرّے میں دو صفتیں پائی جاتی ہیں:

ایک حرکت اور ایک جذب، اپنی طرف کھینچنا، ہر ذرہ حرکت بھی کر رہا ہے

اور اپنی طرف کھینچ بھی رہا ہے لیکن ہزارہا، کروڑھا، ارب ھا کھرب ھا ذرّوں کو خالق کائنات نے اس نظم وضبط سے پیدا کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، نہ وہ ایک دوسرے میں جذب ہوتے ہیں۔ (صلواۃ)

تو وہ کہتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ذات نے ہر ہر چیز کو اپنے اپنے مقام پر اس نے اس طرح فٹ کردیا ہے کہ مجال نہیں کہ ایک دوسرے سے کوئی ٹکرا سکے۔ ایک دوسرے میں جذب کرسکے۔ اسی طریقے سے صرف تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر صرف قرآن مجید کی سرسری آیات کے ترجمے ہی آپ پڑھتے جائیں۔

ہمارے پاس تو وقت ہی نہیں ہے؟ ہم فارغ ہی نہیں ہیں ان چیزوں پر غوروفکر کرنے کے لیے۔ ہم ہوں، ہماری اولاد ہو۔ ماں باپ کو جب اولاد دیکھتی ہے کہ وہ پانچ سوصفحات کا ناول پڑھتے ہیں۔ بیٹا ہو، بیٹی ہو، ماں بھی ناول پڑھتی ہے، والد بھی ناول پڑھتا ہے اور اولاد بھی ناول پڑھے گی۔ جیسے ماں باپ کو کلمہ نہیں آتا اسی طرح اولاد کو بھی کلمہ نہیں آئے گا۔

تو میرے محترم ـــــ!

تھوڑا سا وقت اس کے لیے بھی نکالیں کہ دینی کتب کا مطالعہ کریں۔ آپ مطالعہ کریں گے تو آپ کی اولاد مطالعہ کرے گی۔ یہ جو بے راہ رویاں نوجوانوں میں آرہی ہیں۔

یادرکھیے ـــــ!

حدیث کے لفظ ہیں کہ قیامت کے دن بُری اولاد اچھے ماں باپ کا گریبان پکڑے گی کہ آپ نے ہماری تربیت نہیں کی، آپ نے ہمیں صحیح راستے پر

نہیں لگایا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی مشہور و معروف حدیث ہے کہ:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ

ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے"۔

اگر، یعنی وہ فطرتاً توحید کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے، ماں باپ اس کو یہودی بنا دیتے ہیں، عیسائی بنا دیتے ہیں۔ اس لیے کہ سب سے پہلے مربی اس کی ماں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خصوصاً ماں کے سلسلہ میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے:

"بچو اس سبزے سے کہ جو گندگی کے اُوپر اُگا ہوا ہو"۔

عجیب فقرے ہیں پیغمبرؐ کے کہ بچو اس سبزے سے کہ جو گندگی پر اُگا ہو۔ اگر کتنا ہی اچھا سبزہ، گلاب کے پھول گندگی کے ڈھیر پر اُگیں تو جب سونگھیں گے تو بدبو ہی آئے گی۔

تو پوچھا گیا یارسولؐ اللہ! اس سے مراد کیا ہے؟

فرمایا: خوبصورت عورت گندے ماحول میں پلے۔

ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے کہ ہم نے بچے کی شادی کرنی ہے تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ دیکھا جائے کہ کون زیادہ مال دار ہے؟ جہیز کہاں سے زیادہ آئے گا؟ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ لڑکی آیا دیندار بھی ہے یا نہیں۔ آیا وہ خدا و رسولؐ کو بھی پہچانتی ہے یا نہیں۔

میں تو خصوصاً جسارت کرتا ہوں سادات عظام کی طرف کہ جن کے گھر سے پردہ رائج ہوا تھا مگر اب سیدزادیاں بے پردہ ہیں حالانکہ میں نے بات بھی کی ہے کہ آخر اس مظلوم خاندان کو بدنام کیوں کرتے ہو۔ جب آپ کا کام بھانڈوں

والے کرتے ہیں تو کم از کم اپنے آپ کو سید تو نہ کہلواؤ۔ جس رنگ میں لگے ہوئے ہیں لہٰذا اپنے نام بھی ویسے ہی رکھو۔

ان پاکیزہ شخصیات کہ جن کے گھر کا تطہیر طواف کرتی ہے اس گھر سے نسبت منسوب کر کے اگر ہم بُرے کام کریں تو یاد رکھیے!

احادیث میں آیا ہے سید اگر اچھا کام کریں تو اس کو دگنا ثواب ہے اور اگر بُرا کام کرے تو اس کو دگنا گناہ ملے گا۔ اس لیے کہ نسبت ہے پیغمبر کی۔ ساری دنیا احترام کرتی ہے سادات کا۔ کیوں؟ ان کے کردار کی وجہ سے نہیں بلکہ اس نسبت کی وجہ سے، کہ یہ منسوب ہیں، اولادِ پیغمبرؐ کہے جاتے ہیں۔ تو کم از کم انھیں تو خیال رکھنا چاہیے کہ ہم بھی اولادِ پیغمبرؐ ہیں۔

جو اپنے آپ کو سید کہلواتے ہیں انھیں تو نمونہ بننا چاہیے دنیا کے سامنے، کردار کے لحاظ سے، گفتار کے لحاظ سے، اسی طریقہ سے ہماری خواتین، ان کو نمونہ ہونا چاہیے دوسری خواتین کے لیے۔

یہی وجہ ہے کہ مسجد نبوی میں پیغمبرؐ سوالات کرتے تھے صحابہ کی تربیت کے لیے، فرمایا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر چیز کیا ہے؟ تو کوئی صحابی نہ بتا سکا۔ یہ اطلاع جناب سیدہؑ تک پہنچی تو آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ ''اچھی خاتون کے لیے سب سے بہتر چیز یہ ہے کہ نہ اس کی نظر غیر محرم پر پڑے اور نہ کسی غیر محرم کی نظر اس پر پڑے''۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسالت مآبؐ جناب سیدہؑ کے دروازے پر تشریف لے آئے، دستک دی۔

جناب سیدہؑ نے پوچھا: کون؟

فرمایا: میں آنا چاہتا ہوں، اجازت ہے؟

سیدہؑ نے عرض کیا: بابا جان! آپ کو اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ تشریف لے آئیں۔

فرمایا: میرے ساتھ ایک صحابی ہے، یہ سن کر جناب سیدہؑ خاموش ہوگئی۔ پیغمبر سمجھ گئے کہ فاطمہؑ نہیں چاہتی اور پیغمبرؐ اسلام واپس چلے گئے۔ دوسرے دن جب تشریف لے آئے تو فرمایا: سیدہؑ کل آپ نے اجازت کیوں نہ دی؟

تو فرمایا کہ بابا میری چادر اتنی نہ تھی کہ اپنے پورے بدن کو ڈھانپ سکتی۔

تو حضورؐ نے فرمایا کہ بیٹا وہ تو نابینا تھا۔

تو عرض کیا: بابا جان! وہ نابینا تھا مگر میں تو نابینا نہیں ہوں۔

اب جو اپنے آپ کو جناب سیدہؑ کی کنیزیں کہلاتی ہیں وہ سوچیں۔ آپ نے کبھی غور کیا یا نہیں کہ لفظ عورت عربی زبان کا لفظ ہے۔ عورت کا معنی ہی پوشیدہ رکھنے کی چیز ہے۔ مستور کا معنی بھی وہی پوشیدہ چیز ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ نظامِ اسلام...... نظامِ اسلام...... نظامِ اسلام کیسے آئے جب تک ذہن نہ بدلیں۔ اس وقت تک نظامِ اسلام نہیں آسکتا۔ ایران میں کس طرح نظامِ اسلام آگیا۔ اس لیے کہ ذہن بدلے اور اب آپ جا کر دیکھیں تو ایک پانچ سال کی بچی بھی آپ کو بغیر چادر کے نظر نہیں آئے گی۔

لہٰذا جب تک اذہان نہ بدلیں، فکر نہ بدلے، معاشرہ نہ بدلے اس وقت تک نظامِ اسلام نہیں آسکتا۔ اور جو نظامِ اسلام کہتے ہیں وہ بھی اُوپر اُوپر سے کہتے ہیں۔ اگر دل سے کہتے ہوں تو پھر نظامِ اسلام اپنے گھر سے شروع کریں۔ میں خود اگر اسلام پر عمل نہ کروں اور دوسروں کو کہتا پھروں تو پھر وہی اکبر والا حساب ہے۔

اکبر نے کہا تھا کہ ہم نے یہ جو نظام بنایا تھا، ہے تو بہت اچھا مگر لوگ عمل کیوں نہیں کرتے تو کہا گیا کہ جب حضور خود اس پر عمل نہیں کرتے تو دوسرے کیا کریں گے؟

تو بہر حال، میرے دوستو____!

اصل یہ ہے کہ ہم اگر واقعاً اسلام سے محبت رکھتے ہیں، دین سے محبت رکھتے ہیں، خاندانِ رسالتؑ سے محبت رکھتے ہیں، ان کے عمل کو، ان کے کردار کو، ان کے طریقۂ کار کو، ان کی سنتوں کو، جس قسم کا وہ معاشرہ چاہتے تھے اس قسم کا ہم خود معاشرہ بنائیں۔

ہم اس کے محتاج نہیں ہیں کہ کوئی قوانینِ اسلام نافذ کرلے۔ لہٰذا ہم اپنے گھروں کو غلط چیزوں سے پاک کریں۔ ہم میں سے آج کسی کا گھر اس قابل نہیں ہے کہ اگر امام زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف کا ظہور ہو جائے تو ہم کہہ سکیں کہ حضورؑ ہمارے گھر تشریف لے آئیں۔

ویسے ہر نماز کے بعد ہم کہتے ہیں: عَجَّلَ اللّٰهُ فَرَجَهُ الشَّرِيف کہ خدا جلدی سے ان کا ظہور فرمائے۔ مگر اس جلدی کے لیے ہم نے کون سی جلدی کی ہے۔ اگر ہمیں درد ہے، ہمیں دکھ ہے کہ خاندانِ رسالت کا اُجڑا گھر پھر آباد ہو، تو ہم پھر وہ کچھ کریں جو اس کی آبادی کے لیے ضروری ہے۔ اپنے گھر کی اصلاح کریں، اپنی اولاد کی اصلاح کریں تو پھر ہم کسی کو کہنے کے اہل ہیں کہ تم اپنے گھروں کی اصلاح کرو۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نے اس بدترین معاشرے میں، جو دنیا کا بدترین معاشرہ تھا۔ جہاں علی الاعلان شراب پی جاتی تھی، جہاں خانہ کعبہ کے گرد ننگا طواف کیا جاتا تھا، جہاں بیٹیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا، جہاں حلال وحرام کی

کوئی تمیز نہیں تھی۔ پورے چالیس سال اس بدترین معاشرے میں ایک کردار ادا کیا...... (صلواۃ)

اور ان سے جب اپنے کردار کا لوہا منوا چکے تو ارشاد فرمایا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آ رہا ہے، جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے، جس کو تم نے نہیں دیکھا تو کیا تم میری بات مانو گے۔ انہوں نے کہا کہ بے شک مانیں گے اس لیے کہ ہم نے آج تک اس زبان سے کبھی جھوٹ نہیں سنا۔

پیغمبرؐ اسلام کی صداقت اور امانت کا یہ عالم تھا کہ اعلانِ رسالتؐ کے تیسرے سال بعد جب پیغمبرؐ مکہ سے آنے لگے تو جناب امیرؑ کو اپنے بستر پر لٹایا۔ مورخین نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں۔

ایک یہ کہ آپ چاہتے تھے کہ بستر خالی نہ رہے۔ لوگ یہ سمجھیں کہ پیغمبرؐ اسلام سوئے ہوئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ خاندانِ رسالتؐ کی جو خواتین مکہ میں موجود ہیں ان کو کوئی لے کر آئے اور تیسرا یہ کہ جن لوگوں کی امانتیں پیغمبرؐ کے پاس ہیں وہ امانتیں ان کو واپس کر دیں۔ وہ امانتیں مسلمانوں کی نہیں تھیں۔ مسلمان تو سب جا چکے تھے۔ چند ایک افراد باقی رہ گئے تھے بلکہ وہ امانتیں انھی کی تھیں جو سرکار رسالتؐ مآب کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ گویا وہ جانتے تھے کہ ہم جو ان کو تکلیفیں پہنچاتے ہیں لیکن یہ انہیں خوف نہیں تھا کہ ہماری امانتیں کہیں جا سکتی ہیں۔

لہٰذا اس بدترین معاشرے میں اتنا بہترین کردار پیش کیا کہ صادق اور امین کے القاب سے انہیں یاد کیا جاتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے جانشین بھی اسی قسم کے تھے۔ ان کے متعلق باوجودیکہ ان پر ظلم و ستم ڈھائے گئے، ان کو قیدوں میں رکھا گیا لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کے کردار میں نقص ہے۔

چنانچہ بدترین دشمن جنابِ امیرؑ کا، اس کے دربار میں ایک شخص گیا تو کہنے لگا کہاں سے آئے ہو؟ اس کو خوش کرنے کے لیے۔ کہا کہ اس شخص کی طرف سے آرہا ہوں کہ جو سب سے زیادہ بخیل ہے۔

کہنے لگا تم کہتے ہو کہ وہ بخیل ہے۔ اگر ایک پہاڑ سونے کا اس کو دے دیا جائے اور دوسرا پہاڑ بھوسے کا دے دیا جائے تو وہ پہلے سونے کے پہاڑ کو لٹائے اور بھوسے کے پہاڑ کو بعد میں اور تو کہتا ہے کہ وہ بول نہیں سکتا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو دنیا میں فصاحت و بلاغت کا کوئی مفہوم ہی نہ ہوتا۔ (نعرۂ حیدری)

ایک بندہ امیرِ شام کے دربار میں جاتا ہے اور وہ اس سے کہتا ہے کہ علیؑ کے اوصاف بیان کرو۔ اب یہ خطرہ ہے کہ اگر علیؑ کے اوصاف بیان کروں گا تو یہ نہ ہو کہ کہیں سر قلم کروا دے۔ کہنے لگا: مجھے اس سے معاف رکھو۔ کہنے لگا کہ نہیں۔ تو اب اس نے مولاؑ کے اوصاف بیان کرنا شروع کیے۔ کہتا ہے کہ علیؑ وہ ہیں کہ جو ہم میں اس طرح رہتے تھے کہ جس طرح ہم میں سے ایک ہیں۔

یہ کہا کیا جا رہا ہے؟ جہاں ایک تخت لگا ہوا ہے، کرسیاں لگی ہوئی ہیں، جہاں بادشاہ بیٹھتا ہے، وزیر بیٹھتے ہیں لیکن کہتا ہے کہ ہم اُن کے دبدبہ سے کوئی بات نہیں کرسکتے تھے، ان کی روحانیت کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ ہم کوئی بات نہیں کرسکتے تھے۔ وہ کھدر کا لباس پہنتے تھے اور کھدر کا لباس بھی کیسا؟

خود فرماتے ہیں نہج البلاغہ میں: میں نے اپنے کُرتے کو اتنے پیوند لگائے کہ اب مجھے پیوند لگوانے سے شرم آتی ہے۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ علیؑ اس کو پھینک دو۔ میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ جو مسافر شام کو سفر کرتا رہتا ہے اور صبح گھر پہنچتا ہے تو اپنے سفر کی تعریف کرتا ہے۔ (نعرۂ حیدری)

یہ لباس تھا علیؑ کا۔ کھانا کیسا تھا؟

ایک شخص کہتا ہے کہ میں امیرالمومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ میں نے دیکھا کہ جنابِ امیرؑ کے پاس ایک تھیلی رکھی ہوئی ہے اور اس کے اُوپر مہر لگی ہوئی ہے۔ میں یہ سمجھا کہ شاید اس میں کوئی درہم و دینار ہوں گے۔ اس لیے تو اس پر مہر لگی ہوئی ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ جب مغربین کی نمازِ علیؑ پڑھ چکے تو وہ مہر توڑی، اور اس میں جَو کے خشک ٹکڑے کہ جن کا چھلکا بھی صاف نہیں کیا۔

میں نے عرض کیا کہ مولا یہ کوئی اتنی قیمتی تو نہیں ہے کہ ان پر مہر لگائی جائے؟

فرمایا: میں مہر اس لیے لگاتا ہوں کہ میری اولاد میں سے کوئی روغنی چیز اس میں نہ ڈال دے۔ اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ وہی کھانا کھا کے جاؤں جو رسولؐ کھاتے تھے۔

تو میرے محترم!!

علیؑ اور اولادِ علیؑ کو ماننا یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کس طریقے سے گزاری۔

جنابِ امیرؑ فرماتے ہیں نہج البلاغہ میں کہ اس طرح تم زندگی نہیں گزار سکتے جس طرح میں گزار رہا ہوں لیکن کم از کم میرا ساتھ دو، گناہوں سے بچنے اور نیکیوں کے کرنے سے۔

ذکرِ مصائب: شہادتِ حبیب ابن مظاہر

بس اتنا عرض کرتا ہوں کہ حسینؑ اور یزید کی لڑائی بھی اسی بات پر تھی۔

حسینؑ چاہتے تھے کہ دنیا خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور یزید چاہتا تھا کہ نہیں۔ آزادانہ زندگی ہونی چاہیے۔

حسینؑ کا عمل، حسینؑ کا کردار، حسینؑ کے ارشادات یزید کو چبھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے حاکمِ مدینہ کو جو خط لکھا تو اس کے ساتھ ایک اور خط میں یہ تھا کہ خط کے جواب کے ساتھ حسینؑ کا سر بھی بھیج دو۔ پس آپ کا مظلوم امامؑ مدینہ کو چھوڑ کر مکہ کو حرم سمجھ کر وہاں رہے۔ آپؑ کو وہاں بھی نہ رہنے دیا۔ چلتے چلتے حسینؑ آج کی تاریخ کو ایک ایسی منزل پر پہنچے جہاں حسینؑ کا گھوڑا رُکا۔

یہ تو صرف واقعات کو اُجاگر کرنے کے لیے پوچھا ورنہ حسینؑ کو علم تھا۔ پوچھتے ہیں کہ اس زمین کا کیا نام ہے؟ تو جواب ملا کہ اس کو غاضریہ کہتے ہیں۔

فرمایا: اس کا کوئی اور نام بھی ہے؟

کہا: اس کو ماریہ کہتے ہیں۔ جب چند مرتبہ آپ نے دہرایا تو کہا گیا: مولاؑ! اس کو کربلا بھی کہتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ حسینؑ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور حکم دیا کہ خیمے یہاں لگا دو۔ زہراؑ کی بیٹیوں کو خیموں میں اُتار دیا جائے۔

فرمایا: یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم شہید ہوں گے۔ اور یہی سے قیامت کے دن محشور ہوں گے۔

اِدھر حسینؑ کربلا میں پہنچ گئے۔ اُدھر فوجوں کی فوجیں آنے لگیں۔ بعض روایات میں ہے کہ جب کوئی فوجی دستہ کربلا میں آتا تھا اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز زہراؑ کی بیٹیوں کے کانوں میں جاتی تھی تو کہتی تھیں:

بھیا حسینؑ! یہ فوج کس کی ہے؟

تو مظلوم سر جھکا کر کہتے تھے کہ یہ یزید کی فوج ہے۔

آخر ثانی زہراؑ نے کہا کہ آپ بھی کسی کو اپنی مدد کے لیے بلائیں۔

بعض روایات میں ہے کہ حسینؑ نے ایک خط لکھا، اپنے ایک بچپن کے ساتھی کے لیے جس کا نام حبیبؓ ابن مظاہر ہے۔

لکھا کہ حبیبؓ میں مشکل میں گھر چکا ہوں لہذا میری مدد کو آسکتے ہو تو آؤ۔

بس حبیبؓ کو خط ملا اور اپنے غلام سے کہا کہ گھوڑا کھیتوں میں لے جاؤ۔

حبیبؓ بڑی مشکل سے کربلا پہنچے اور بیبیوںؑ کو پتہ چلا تو بی بی زینبؑ نے فِضہ سے کہا: جا کر حبیبؓ سے کہہ دو کہ علیؑ کی بیٹی تمہیں سلام کہتی ہے۔

جب فِضہ نے جا کر حبیبؓ کو بی بی کا سلام پیش کیا تو حبیبؓ نے اپنا منہ پیٹ لیا۔

پروردگار! خاندانِ رسالتؐ اتنا مظلوم ہو گیا ہے کہ اب زہراؑ کی بیٹیاں مجھے سلام کہتی ہیں۔

●......●......●

مجلس سوم

* دین کا مفہوم کیا ہے اور اسلام کسے کہتے ہیں؟
* اسی طریقے سے دین کے درخت کی سب سے پہلی ایک بنیادی جڑ ہے۔
* جب یہ سب ہوگا تو پھر اعمال و کردار کی بھی کوئی قیمت ہے۔
* جس کو ہم دین کہتے ہیں یا مذہب کہتے ہیں وہ سنا سنایا ہے، پڑھا پڑھایا نہیں ہے۔
* وہ شیطان کو خدا سمجھتے ہیں اور یزید کو اس کا پیغمبر جانتے ہیں۔
* یارسولؐ اللہ! وہ کتاب کہاں ہے جو آپؐ چھوڑے جا رہے ہیں؟
* اے مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بنانا۔
* وہ تو خود ایک دوسرے کے دوست ہیں تمہارے نہیں۔
* ہر ملک و ملت کے لوگ اپنے بزرگوں کی یادگاروں کی حفاظت کرتے ہیں۔

ذکرِ مصائب: حبیبؓ، زہیرؓ اور سعیدؓ کی شہادتیں

* اگر تم حسینؑ کی مدد کے لیے نہیں جا سکتے تو یہ مردانہ لباس مجھے دو میں جا کر حسینؑ کی مدد کروں گی۔
* حسینؑ کسی کو اپنی مدد کے لیے مجبور تو نہیں کرتے، جا کر دیکھو تو سہی کہ حسینؑ کیا کہتے ہیں؟

مجلسِ سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارشادِ رب العزت ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (سورہ آل عمران، آیہ۱۹)

"یقیناً اللہ کے نزدیک ہمیشہ کے لیے دین اسلام ہے"۔

عرض کیا جاچکا ہے کہ دین کا مفہوم کیا ہے اور اسلام کسے کہتے ہیں؟ اب دین کو جس کا اللہ کے ہاں دوسرا نام اسلام ہے جب تک اللہ کے ہاں اسلام ہے۔ جب لفظ دین بولا جائے تو اللہ اور اللہ والوں کے نزدیک وہ کسی زمانے میں بھی ہوں مراد اسلام ہوگی۔

تو اب اس اسلام کو آیاتِ قرآنی میں بھی اور احادیث میں بھی ایک درخت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اسلام اور دین ایک درخت ہے۔ اب وہ درخت چند چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کچھ حصہ وہ ہے کہ جس پر اس درخت کی بنیا ہے جو کہ نظر نہیں آتا اور اگر وہ بنیاد موجود نہ ہو، وہ حصہ موجود نہ ہو جو نظر نہیں آ تو درخت قائم نہیں رہ سکتا۔ آپ کی زبان میں اس حصے کو جڑیں کہتے ہیں اور عر میں اس حصے کو اصول کہتے ہیں۔

جب آپ کہتے ہیں اصول دین، یا کسی کتاب میں آپ پڑھتے ہیں تو اس کا معنی ہے جڑیں۔ اب مکمل درخت اس وقت بن سکتا ہے کہ جب اس کا وہ حصہ بھی موجود ہو، جو زیرِ زمین ہے اور وہ سارا حصہ بھی ہو کہ جو باہر ہے۔ جب تک اس درخت کا تنا نہیں ہوگا، اس کی شاخیں نہیں ہوں گی، اس کی ٹہنیاں نہیں ہوں گی۔ اس کے پتے نہیں ہوں گے اور اس کا پھل نہیں ہوگا۔ وہ درخت مکمل درخت نہیں ہے۔

تو اسی طریقہ جیسے درخت کے لیے جڑوں کی ضرورت ہے، اسے درخت کہنے کے لیے۔ اسی طریقہ سے تنے کی بھی ضرورت ہے۔ شاخوں کی بھی ضرورت ہے، ٹہنیوں کی بھی ضرورت ہے۔ تو اگر کوئی کہے کہ میں اصول کو تو مانتا ہوں، تسلیم کرتا ہوں تو ایسے ہی ہے جیسے ایک درخت ہو کہ جڑیں اس کی موجود ہوں اور اُوپر سے آپ اس کو کاٹ دیں تو جڑیں کوئی فائدہ نہیں دے سکیں گی۔ جب تک اس کا سب کچھ جو اُوپر ہوتا ہے وہ نہ ہو۔ جتنی جڑیں مضبوط ہوں گی اتنا درخت مضبوط ہوگا، اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب مضبوط ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ ان جڑوں میں بھی ایک پہلی جڑ ہوتی ہے۔ ایک بنیادی جڑ ہوتی ہے تو جب تک وہ جڑ نہ ہو تو باقی بھی اس کی فرع ہیں، اس کی شاخیں ہیں۔

تو اسی طریقے سے دین کے درخت کی سب سے پہلی ایک بنیادی جڑ ہے جس کے متعلق امیر المومنینؑ نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُهٗ

"دین کی پہلی کڑی معرفت پروردگار ہے"۔

اگر خدا کی معرفت صحیح ہوئی تو پھر اس کے انبیاءؑ کی معرفت ہوسکے گی۔ تو

جب انبیاءؑ کی معرفت ہوگی، تو آئمہؑ کی معرفت بھی ہوگی۔ تو قیامت کے متعلق بھی یقین پیدا ہوگا۔

جب یہ سب ہوگا تو پھر اعمال و کردار کی بھی کوئی قیمت ہے۔ اگر جڑیں مضبوط نہیں ہیں اور اُوپر کسی طریقہ سے شاخیں اُگ آئی ہیں۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک عرصہ تک وہ درخت آپ کو ہرا بھرا نظر آئے۔ لیکن اگر اس درخت کی جڑیں مضبوط نہیں ہیں تو اس کا سبزہ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا جیسے شاخوں کی ضرورت ہے، اسی طریقہ سے، اس سے زیادہ، اس سے پہلے جڑوں کی ضرورت ہے اور جڑوں میں سب سے پہلی جڑ، پہلی اصل دین کی، وہ توحید پروردگار عالم ہے۔

ظاہراً یہ نسبتاً خشک سا مضمون ہے، لہٰذا اس میں مَیں آپ کو اُلجھانے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن میرے دوستو! میرے بزرگو!

میں کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں آپ کی خدمت میں کہ ہمارے ہاں عموماً جس کو ہم دین کہتے ہیں یا مذہب کہتے ہیں وہ سنا سنایا ہے، پڑھا پڑھایا نہیں ہے ورنہ ایسی ایسی چیزیں ہمارے سامنے بیان ہوئی ہیں اور وہ جزوِ مذہب گویا فرض کی گئی ہیں کہ شاید ان کا دُور سے بھی مذہب اور دین سے تعلق نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے پڑھا، کسی صاحب کی تقریر تھی اور اس میں یہ لکھا ہوا ہے اور اس میں پڑھنے والے نے کہا کہ یہ تو خدا نے اہلبیتؑ کو جلدی جلدی پیدا کر دیا ورنہ وہ خود بخود پیدا ہونے لگے تھے۔

اب بھولی بھالی مخلوق کو کیا پتہ، کہ آخر عدم سے وجود میں آنے کے لیے

کسی سبب کی ضرورت ہوتی ہے خود بخود کوئی کس طریقے سے وجود میں آ سکتا ہے۔

کوئی بزرگ بیان فرما رہے تھے کہ دیکھو کہ اللہ مومن ہے، قرآن میں ہے کہ:

اَلْمُؤْمِنُ (سورۂ حشر، آیت ۲۳)

اللہ کی صفات میں سے ایک صفت مومن بھی ہے اور رسول بھی مومن ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵)

"رسول ایمان لے آیا"۔

تو اب بتایئے کہ امیر المومنینؑ کون ہوگا، اب لوگ نعرے لگا رہے ہیں لہٰذا ہم پڑھنے والوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کوئی انوکھی سی بات کی جائے جس پر مجمع اُچھل جائے۔ وہ صحیح ہو، غلط ہو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

تو اس صحیح اور غلط کا امتیاز کب ہوگا۔ جب آپ خود بنیادی کتابیں پڑھیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمیں ایک زمانے تک، مناظرے میں اُلجھایا گیا۔ دشمن کی ایک سازش تھی، انگریز نے چاہا کہ اس ملک پر حکومت کرے، کہیں ہندو مسلم فسادات کرا دیئے، کہیں شیعہ و سُنی فسادات کرا دیے۔

تو بھولے بھالے مسلمان کو کہا گیا کہ وہ تمہارا دشمن ہے، تم اس کے خلاف کچھ کرو۔ تو یہ انگریزوں کے زمانے میں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں بڑی آزادی تھی۔ عام مناظرے ہوتے تھے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ مسلمان ایک دوسرے سے کٹتے گئے اور یہاں تک پہنچ گئے۔ اب مسلمانوں کے اس ملک میں یزید جیسے شخص کو روزناموں میں امیر المومنین لکھا جا رہا ہے۔

اگلے دن ایک صاحب مجھے ایک روزنامہ دکھا رہے تھے اس میں اس لعین کے نام کے ساتھ امیر المومنین لکھا ہوا تھا اور وہ بڑا تعجب کر رہے تھے تو میں نے

ان سے کہا کہ آپ تو اس روزنامے کو روتے ہیں، اس ملک میں ایک پورا ادارہ کراچی میں بنا ہوا ہے اور اس ادارہ کا نام ادارہ عثمان غنی ہے اور آج سے کوئی چار پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ چودہ کتابیں اس وقت تک یزید کی شان میں اس وقت تک شائع ہو چکی تھیں اور اس کی شاخیں مختلف جگہوں پر ہیں۔

میں نے دو تین روز پہلے ایک رسالہ چھوٹا سا "فرقہ یزیدیہ" کے نام سے نشر کیا تھا۔ وہ فرقہ عراق اور ترکی کے علاقوں میں کہیں کہیں آباد ہے۔ وہ شیطان کو خدا سمجھتے ہیں اور یزید کو اس کا پیغمبر سمجھتے ہیں۔ تو میں نے اس میں کہا تھا کہ یا اس کا ان سے تعلق ہے اور یا یہ باہر سے، تو ایک عرصہ سے مسلمانوں کو آپس میں اُلجھانے کے لیے اس قسم کے ادارے قائم کیے گئے اس لیے کہ تمام مسلمان یقیناً یزید کو فاسق و فاجر اور بے دین انسان سمجھتے ہیں۔ بدترین کردار سمجھتے ہیں۔ اہلِ سنت بھی یزید کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اگر کسی صحابی جو پیغمبرؐ کی بزم میں بیٹھا ہو کبھی بھی، کے متعلق، اس کے خلاف کوئی بات کہہ دے تو اس کے لیے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ تو چہ جائیکہ جو رسولؐ کی زبان چوس چوس کر پلا ہو، جو گودِ رسالتؐ میں پلا ہو، اس کا جو قاتل ہو، اس پر جو ظلم کرے، اس کو کیا مسلمان اچھا سمجھیں گے؟

یہ نہیں ہو سکتا، ان کا مسلمانوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، یہ تو مسلمانوں کو لڑانے کے لیے ایک سازش ہے تاکہ شیعہ یہ سمجھیں کہ شاید اہلِ سنت یہ کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جو سب سے پہلے یزید کے متعلق کتاب لکھی گئی۔

تو شیعوں کی نسبت اہلِ سنت علماء نے اس کے جوابات لکھے تھے اور اس بات کو ثابت کیا تھا کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو شیعوں کو اہلِ سنت سے

متنفر کرنے کے لیے یزید کے بارے میں کتابیں لکھی گئیں۔ ادھر یوں کیا گیا اور اُدھر یہ کہ مسلمانوں کو شیعوں سے متنفر کرنے کے لیے اس قسم کے پمفلٹ اور اشتہار چھاپے جاتے ہیں کہ شیعہ اس قرآن کے قائل نہیں ہیں۔ اس قرآن کو وہ اللہ کی کتاب نہیں مانتے، اس قرآن کو وہ تحریف شدہ مانتے ہیں۔

حالاں کہ اہلِ سنت ہمارے سب بھائی جانتے ہیں کہ جو قرآن ان کے گھروں میں ہے وہی قرآن ہمارے گھروں میں ہے۔ جس قرآن کی ان کے علماء نے تفسیر لکھی ہے اسی قرآن کی تفسیر ہمارے علماء نے لکھی ہے۔ جب کوئی آیت سند کے طور پر جس طریقے سے وہ پیش کرتے ہیں اسی طریقہ سے ہم پیش کرتے ہیں بلکہ ہمارے بھائی تو پھر بھی کہتے ہیں کہ قرآن جمع کیا گیا، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ رسولؐ خود جمع کر کے دے گئے تھے۔

میں نے پچھلے سال کی مجالس میں واضح طور پر عرض کیا کہ جب وہ کتابیں جو منسوخ ہونے والی تھیں وہ مکمل طور پر انبیاءؑ اپنی اُمت کو دے کر گئے۔ یہ تو لوگوں نے بعد میں ان کو محرف کر دیا۔ تو وہ کتاب جس نے تاقیامت رہنا تھا، تو کیا وہ کتاب پیغمبرؐ مکمل طور پر نہیں دے کر گئے؟

حالاں کہ یہ حدیث پیغمبرؐ کی تو متفق بین الفریقین ہے کہ حضوؐر نے فرمایا کہ میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور ایک اہلِ بیتؑ۔ اس کو اتنی مرتبہ آپ نے کہا کہ ہمارے لکھنؤ کے عالم سرکار حامد حسین اور ان کے بیٹے تھے ناصر الملت، انہوں نے دو جلدیں اتنی بڑی جس میں یہ ثابت کیا کہ یہ حدیث کہاں کہاں موجود ہے۔ اب اس کے مقابلے میں ایک حدیث یہ بھی بنا دی گئی کہ نہیں حضوؐر نے فرمایا: میں قرآن و سنت چھوڑے جا رہا ہوں، یا بعض اوقات یہ کہا

گیا کہ میں صرف قرآن چھوڑے جا رہا ہوں۔ لیکن میرے محترم وہ حدیث کہ جس میں یہ ہے کہ میں کتاب واہلِ بیتؑ چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس کی اسناد تو اتنی ہیں کہ جو کئی سو صفحات میں بیان کی گئی ہیں ۔ اس حدیث میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اس کے متواتر ہونے میں اور ہر زمانے کے علماء نے اس کی اسناد کو تسلیم کیا ہے کہ رسولؐ نے فرمایا کہ میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔

چلو۔۔۔۔!

سنت والی بحث بعد میں کریں گے۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ اس حدیث میں بھی گویا جو حدیث بنائی گئی اس میں بھی دو چیزیں چھوڑی گئیں۔ تو وہاں کسی صحابی نے یہ تو عرض نہیں کیا کہ یارسولؐ اللہ! وہ کتاب کہاں ہے جو آپؐ چھوڑے جا رہے ہیں؟

تو اس کا معنی یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے کتاب چھوڑی تھی، کتاب موجود تھی۔ ساری دنیا کے جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قومی قائد ہیں، قومی رہبر ہیں۔ وہ تو اپنا سارا پروگرام لکھ کر دے جاتے ہیں لیکن جو تا قیامِ قیامت کے لیے رسولؐ تھے وہ اپنا پروگرام نہیں دے کر گئے؟

تو بہرحال۔۔۔۔!

ہمارے نزدیک اور جتنے بھی ہمارے محققین علماء گزرے ہیں ان کا عقیدہ یہی تھا۔ سید مرتضیٰ، شیخ کلینی، شیخ طوسی، شیخ صدوق اور جتنے علماء اب تک موجود ہیں سب کا یہی عقیدہ ہے کہ قرآن رسولؐ کے زمانے میں جمع شدہ تھا اور خود جمع شدہ دے کر گئے تھے...... (صلواۃ)

تو بہرحال۔۔۔۔!

یا یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں فلاں مسائل کے قائل ہیں۔ اصل میرا کہنے کا جو مقصد ہے وہ یہ ہے کہ جو اسلام دشمن طاقتیں ہمیں لڑانے کی کوششیں کرتی ہیں دشمنوں کو پہچاننا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ اشتہار اہل سنت کے خلاف چھاپ دیں گے، کچھ اشتہار شیعوں کے خلاف چھاپ دیں گے۔

کاش وہ مسلمان کہ جن کا ساری دنیا پر دبدبہ تھا، ساری دنیا جن سے ڈرتی تھی، آج مسلمان اتنے ذلیل ہو چکے ہیں باوجود ۹۰ کروڑ یا ایک ارب تک ان کی تعداد ہے تو گویا یہ دنیا کا چوتھا حصہ مسلمان ہوتے ہوئے اور تمام خزائن، تمام ذخائر، تمام نعمتیں، ہر چیز ان کے پاس موجود ہے لیکن ایک چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ ذلیل ہیں اور وہ ہے اتحاد و اتفاق۔

اگر آج بھی دنیائے اسلام میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو جائے اور وہ جو مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی طرف مسلمان متوجہ ہوں اور دشمن کو دشمن سمجھیں، دوست کو دوست سمجھیں تو شاید ہو سکتا ہے۔ مگر بعض مسلمان کہتے ہیں کہ ہمارے فلاں فلاں دوست ہیں۔ اب قرآن سے پوچھتے ہیں کہ ہمارے کون کون سے دوست ہیں۔ تو قرآن مجید کی ایک واضح آیت موجود ہے جس میں خالق کائنات کہتا ہے مسلمانوں کو خطاب کر کے:

لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ (سورۂ مائدہ، آیہ ۵۱)

"اے مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنے دوست نہ بنانا"۔

یہ قرآن کی آیت ہے۔ آگے اس کی وجہ بتاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (سورۂ مائدہ، آیہ ۵۱)

''وہ تو خود ایک دوسرے کے دوست ہیں تمہارے نہیں''۔

اور پھر آگے ارشاد ہوتا ہے: جو شخص ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ بھی انہی میں سے ہے۔ تو اگر قرآن حق ہے اور یقیناً حق ہے ہر مسلمان کا عقیدہ ہے تو وہ کہتا ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہارے دوست نہیں بن سکتے۔ یہ تو آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ زندہ قرآن کا معجزہ اس چودہ صدیوں کے بعد اس کی صداقت اس وقت موجود ہے۔

۹۰ کروڑ مسلمان جو کہتے ہیں کہ فلاں طاقت ہماری دوست ہے، جب کہیں اسرائیل کے خلاف یہ ۹۰ کروڑ مجتمع ہو کر کوئی قرارداد پیش کرنے لگے تو وہ جو سب سے بڑا ملک ہے وہ دھوکا کر دیتا ہے۔

تو دوستو ـــــ!

لہٰذا جہاں جہاں تک میری آواز جارہی ہے، ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جانا چاہیے۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس بات پر تو اتفاق ہے کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس بات پر تمام اُمت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ قرآن ہماری کتاب ہے۔ اس بات پر تمام اُمت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ سرکار رسالتؐ آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا۔ اس بات پر پوری اُمت اسلامیہ کا اتفاق ہے کہ رسولؐ کے بعد اس کا کوئی جانشین ہونا چاہیے۔ اور گویا عام ہمارے بھائیوں کے نزدیک تو اتنا اہم تھا کہ اتنا اہم تو رسولؐ کا جنازہ بھی اہم نہیں تھا۔ صرف فرق اتنا ہے کہ اس کو معین کون کرے؟

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بنیادی طور پر فرق نہیں ہے۔ ضرورت وہ بھی محسوس کرتے ہیں اور ضرورت ہم بھی محسوس کرتے ہیں صرف یہاں اختلاف ہے کہ یہ ہونا چاہیے اور یہ ہونا چاہیے۔

تو لہٰذا مسلمانوں کو ایک دوسرے کے نظریات و عقائد کو برداشت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور احکامِ خدا کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔ یہ نہیں ہے کہ کوئی پمفلٹ اگر چھپا ہے، تو فلاں فرقہ کے خلاف ہے، تو لہٰذا ہم خوش ہوں۔

نہیں میرے محترم!!

یہ بھی دیکھیں کہ کہیں حکمِ خدا کے خلاف تو نہیں ہے، مثلاً اگر قرآنِ مجید کی کوئی آیت کہتی ہے، یہ نکاح بھی جائز ہے اور اس پر احادیث بھی موجود ہیں اور جس بزرگ نے اس کو منع کیا تھا وہ خود کہتے ہیں کہ رسولؐ کے زمانے میں تھا۔ تو اس کا مذاق اڑانا اور کہنا کہ یہ بدکاری ہے۔ تو یہ صرف ایک فرقہ کی مخالفت نہیں ہے۔ رسولؐ کی مخالفت ہے۔

اب بعض لوگ خصوصاً اُدھر حرمین شریفین کے جو محافظین ہیں، اب مصیبت یہ ہے کہ جہاں عقل و فکر نہ ہو، تو پھر معاملہ بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

پچھلے سے پچھلے سال مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔ تو مسجد نبویؐ میں اتفاق سے بھیڑ زیادہ تھی تو میں نے ایک ہاتھ مسجد کے ستون پر رکھ دیا تو ایک آدمی میرا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے حرام ہے۔

میں نے کہا: اے بندۂ خدا! اس میں کون سی حرمت آ گئی ہے۔ میدانِ خندق میں کوئی چھ مسجدیں ہیں جن میں سے ایک مسجد جناب سلمان فارسیؓ کے نام کی ہے، ایک جناب سیدہ کے نام کی ہے، ایک امیرالمومنینؑ کے نام کی ہے، ایک

مسجد فتح ہے، کچھ اور اصحاب کے نام کی بھی ایک دو مساجد ہیں۔ وہاں پر اسٹکر لگا ہوا تھا کہ سوائے چار مساجد کے باقی مساجد میں نماز پڑھنا حرام ہے۔

شاید میں نے کسی مجلس میں کہا تھا کہ یہ فطرت انسان میں داخل ہے، چاہے وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتا ہو، حتیٰ کہ وہ جن کا کوئی دین و مذہب ہی نہیں ہے کہ جو ان کے محسن ہیں، جن کو وہ اپنا بزرگ سمجھتے ہیں، وہ ان کی یادوں کو برقرار رکھتے ہیں۔ مثلاً قائداعظم مرحوم تھے، اقبال تھے، ان کی جتنی چیزیں جو ان کے ساتھ منسوب ہیں ان کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ ہر ملک وملت کے لوگ اپنے بزرگوں کی یادگاروں کی حفاظت کرتے ہیں لیکن یہ انوکھی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی جو سعودی عرب میں ہے۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ چودہ سو سال سے جن چیزوں کو مسلمان اب تک محفوظ رکھے چلے آئے تھے، کوشش کی جارہی ہے کہ وہ محفوظ نہ رہیں۔

جنت البقیع میں صرف آئمہؑ کی قبور تو نہیں تھیں، ازواج پیغمبرؐ کی قبریں بھی ہیں۔ اصحاب پیغمبرؐ کی بھی ہیں، بدر کے شہداءؓ کی قبریں بھی ہیں۔ رسولؐ کے بیٹے جناب ابراہیم کی قبر بھی تھی۔

تو اب قبروں کو مٹانا، ان کے نشانات کو ختم کرنا اور جنت البقیع کے گرد چار دیواری ایسی بنا دینا کہ کوئی اندر ہی نہ جاسکے، کیا فائدہ ہوگا ان کو۔ کئی مساجد ایسی ہیں کہ آہستہ آہستہ ان مساجد کو ختم کیا جارہا ہے۔ یہ کام وہ کرسکتے ہیں کہ جن کے نزدیک عقل آئی ہی نہیں (عقل جن کے نزدیک تک نہیں آئی)۔ یا پھر دوسرے لفظ یہ ہیں کہ ظاہراً کلمہ پڑھتے ہیں ورنہ جس سے محبت ہو، جس سے پیار ہو، کون ہے دنیا کا انسان کہ اس کی یاد کو، اس سے منسوب چیزوں کو وہ زندہ نہ رہنے دے۔

تو یہ وہ باتیں ہیں کہ جو مسلمانوں کے شعور میں آنی چاہئیں۔ سب سے پہلے مسلمانوں کا آپس میں پیار و محبت ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس لیے کہ پیغمبرِ اسلام کا ارشاد ہے:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ يَدِهٖ وَلِسَانِهٖ

''مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ سے اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے''۔

آپ فرماتے ہیں:

اَلْمُسْلِمُ اَخُ الْمُسْلِمِ

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے''۔

ایک دوسرے کا مال، ایک دوسرے کی عزت، ایک دوسرے کا خون دوسرے پر، اس پہ تجاوز کرنا، ناجائز اور حرام ہے۔ جو اسلام لے آیا ہے وہ کہتا ہے تم بھائی ہو۔

اب اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں والا سلوک نہیں کرتے تو اس کا معنی یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی احادیث سے یا تو ہم جاہل ہیں، یا جان بوجھ کر ان سے ہم رُوگردانی کر رہے ہیں۔

تو میرے دوستو ـــــ!

جہاں جہاں بھی مسلمان رہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہیں۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک دوسرے کی مذہبی رسومات میں مداخلت کرنے کی کوشش نہ کریں۔

اس ملک میں واقعاً نظامِ اسلام کے صحیح طور پر نافذ ہونے کی راہ ہموار

ہو سکے اور اگر ہم سب مسلمان متفق ہو کر ایک دوسرے کو برداشت کرنے لگیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہاں نظامِ اسلام نہ آئے۔ یقیناً آ سکتا ہے لیکن پہلے ہم بھی تو مسلمان بننے کی کوشش کریں تو جب ہم تہیہ کر لیں گے کہ جو تعریف مسلمان کی پیغمبرؐ نے کی ہے اس پر ہم عمل کرنے اور اس کے مطابق چلنے کے لیے تیار ہیں اور پھر یقیناً وہ دن دور نہیں ہے کہ یہ پاکستان ساری دنیا کے لیے اسی طریقے سے نمونہ عمل بنے گا جیسے کہ اس وقت ایران ساری دنیا کے لیے نمونہ عمل ہے۔

ذکرِ مصائب: حبیبؓ، زہیرؓ اور سعیدؓ کی شہادتیں

بس دوستو ــــــ!

کربلا کے میدان میں دوسری محرم کو حسینؑ وارد ہوئے، اور فوجوں پہ فوجیں آنے لگیں، جو بھی فوج کا دستہ آتا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز زینبؑ کے کانوں میں پہنچتی تھی تو پوچھتی تھی: بھائی! یہ کس کے ساتھی آ رہے ہیں اور امام مظلومؑ سر جھکا کر فرماتے کہ زینبؑ یہ دشمن کی فوج آئی ہے۔

بعض روایات کے مطابق ثانی زہراؑ نے کہا: دنیا میں اگر آپ کا بھی مددگار ہے تو اس کو بلایئے۔ تو امام مظلومؑ نے ایک خط لکھا۔ اس خط کا عنوان عجیب ہے۔ عربوں میں یہ دستور ہے کہ جب وہ خط لکھتے ہیں تو اگر ضروری سمجھیں تو اپنے نام کے ساتھ باپ کا نام لکھتے ہیں۔ لیکن یہ خط وہ تھا جس میں حسینؑ نے بجائے باپ کے لکھا تھا:

مِنَ الْحُسَینِ ابنِ فَاطِمَۃ

"یہ حسینؑ ابن فاطمہؑ کا خط ہے"۔

اِلَى الرَّجُلِ الفَقِيهه

''ایک عالم، ایک فقیہ شخص کی طرف''۔

کہ جس کا نام حبیب ابن مظاہر ہے۔ حبیب اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی بیوی سے گفتگو کر رہے تھے کہ خبریں آ رہی تھیں کہ مولاؑ کوفہ میں آنے والے ہیں۔ نہ معلوم مولاؑ پر کیا گزری کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی، حبیبؓ گھر کے دروازے پر تشریف لے گئے۔

پوچھا: کون؟

جواب ملا: اَنَا رَسُولُ الحُسَین

''میں حسینؑ کا قاصد ہوں''۔

عزادارو۔۔۔۔۔!

اس قاصد کو انھوں نے گھر کے اندر بلا لیا۔ اس نے خط نکالا، اس کی تعظیم کے لیے حبیبؓ کھڑے ہو گئے۔ خط لیا، بوسے دیے خط کو۔ آنکھوں پہ رکھا۔ جب خط کے مضمون سے مطلع ہوئے تو گھر کے اندر اپنی بیوی کے پاس تشریف لے گئے تو وہ خاتون گھبرا کر پوچھتی ہے: کون آیا تھا؟ کس کا قاصد تھا؟

جنابِ حبیبؓ نے کہا کہ مولا حسینؑ کا قاصد آیا تھا۔ تو وہ خاتون گھبرا کر پوچھتی ہیں کہ پھر مولاؑ نے کیا لکھا ہے؟

حبیبؓ کہتے ہیں کہ مولاؑ نے مدد کے لیے بلایا ہے، اپنی نصرت کے لیے بلایا ہے۔

تو وہ خاتون کہتی ہے کہ پھر حبیبؓ کیا خیال ہے؟

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس خاتون کا دل کیا کہتا ہے حبیبؓ نے کہا کہ

اس کے متعلق سوچیں گے۔

یہ سنتا تھا کہ وہ مومنہ تڑپ اُٹھی اور کہنے لگی: حبیبؓ! زہراؑ کا لال دشمنوں میں گھرا ہوا ہے اور وہ تمہیں مدد کے لیے بلائے اور تم ابھی سوچو گے۔ اگر تم حسینؑ کی مدد کے لیے نہیں جاسکتے تو یہ مردانہ لباس مجھے دو، میں جا کر حسینؑ کی مدد کروں گی۔

حبیبؓ نے اپنی اہلیہ کو دعائیں دیں، فرمایا: نہیں، میں ابھی مولاؑ کی مدد کے لیے جاتا ہوں۔ اپنے غلام سے کہا کہ یہ میرا گھوڑا کھیتوں میں لے جاؤ۔ لوگ ایسا محسوس کریں گے کہ کھیت کی طرف جا رہے ہیں اور میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

چونکہ ہر طرف سے پابندی تھی، راستے بند تھے، لہٰذا چھپتے ہوئے بڑی مشکل سے اس جگہ پر پہنچے جس جگہ انہوں نے اپنے غلام سے کہا تھا کہ گھوڑا وہاں تیار رکھنا۔ لیکن پہنچنے میں حبیبؓ کو کچھ دیر ہوگئی۔ جب حبیبؓ پہنچے تو دیکھتے ہیں کہ وہ غلام گھوڑے سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ گھوڑے! اگر تھوڑی دیر اور حبیبؓ نہ آئے تو میں تیری پشت پر سوار ہو کر کربلا میں جا کر مولاؑ پر قربان ہوں گا۔

یہ سنتا تھا کہ جناب حبیبؓ کی چیخ نکل گئی کہ میرے مولاؑ! آپ اتنے بے بس ہوگئے ہیں، آپ اتنے مظلوم ہوگئے ہیں کہ اب غلاموں کے دلوں میں بھی یہ خواہش پیدا ہوگئی ہے کہ وہ آپ کی نصرت کریں۔

عزادارو ــــــ!

بڑی مشکل سے حبیبؓ کربلا میں پہنچے۔ اب آپ خود اندازہ لگائیے کہ جن کا کوئی یار و مددگار نہیں آیا تھا تو جب حبیبؓ پہنچ گئے تو امام حسینؑ کے خیموں میں ایک چہل پہل سی شروع ہوگئی۔ آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک نئی چیز محسوس ہوئی، اور

یہ چھل پہل کا اثر خیام تک گیا۔

ثانی زہراؑ نے کہا: خادمۂ فضہ سے کہا: کیا بات ہے، یہ کیسی چھل پہل شروع ہوگئی ہے، کیا ہو رہا ہے اور معلوم کر کے آئیں تو کہا:

بی بی! آپ نے خط نہیں لکھوایا تھا حبیبؓ کے لیے تو وہ حبیبؓ آپ کے بھائی کی مدد کرنے کے لیے آگئے ہیں۔

بس عزادارو......!

یہ سننا تھا تو ثانی زہراؑ نے کہا: اے فضہ جا کر حبیبؓ سے کہو کہ زہراؑ کی بیٹی تجھے سلام کہتی ہے۔

عزادارو......!

یہ سننا تھا کہ فضہ نے جا کر حبیبؓ سے کہا کہ زہراؑ کی بیٹی تمھیں سلام کہتی ہے تو حبیبؓ نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہا کہ پالنے والے سادات پر اتنی غربت آگئی۔ اتنی بے کسی چھا گئی کہ زہراؑ کی بیٹی مجھے سلام کر رہی ہے۔

عزادارو......!

یہ ایک حسینؑ کا مددگار تھا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب حسینؑ مکہ سے چلے تو ایک شخص جس کا نام زہیر ابن قین تھا، وہ بھی اپنے قافلے کے ساتھ چلا، لیکن چونکہ ابھی تک وہ معرفتِ امامؑ صحیح معنی میں نہیں رکھتا تھا۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ جہاں حسینؑ پڑاؤ ڈالتے تھے، یہ ذرا دور ہٹ کے خیمے لگاتے تھے۔

اس کا ایک ساتھی بیان کرتا ہے کہ ایک ایسی منزل آئی کہ ہمیں خیمے قریب قریب لگانے پڑے۔ شام کا وقت تھا، دسترخوان بچھا ہوا تھا، ہم کھانا کھانا چاہتے تھے، ابھی لقمے توڑے ہی تھے کہ خیمے کے دروازے پر دستک ہوئی تو ہم نے پوچھا

کہ کون؟ تو جواب آیا کہ میں حسینؑ کا قاصد ہوں۔

پوچھا: کیسے آئے؟

کہا: حسینؑ زہیرؓ کو بلا رہے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ قاصد کا یہ کہنا تھا کہ ہر ایک کے ہاتھ سے لقمہ گر گیا اور تھوڑی دیر خاموشی چھا گئی۔ ساتھ ہی زہیر کی بیوی کا خیمہ تھا۔ جب اس نے خاموشی محسوس کی تو کہنے لگی: سبحان اللہ! ارے زہراؑ کے لال آپ کو بلا رہے ہیں اور آپ خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ حسینؑ کسی کو اپنی مدد کے لیے مجبور تو نہیں کرتے، جا کر دیکھو تو سہی کہ حسینؑ کیا کہتے ہیں؟

اس خاتون کا یہ کہنا تھا کہ زہیر ابن قینؓ اُٹھے۔ تنہائی میں مولاؑ سے ملاقات کی۔ مظلومؑ نے انہیں ایک بھولی ہوئی بات (جو وہ بھول چکا تھا) یاد دلائی۔ تو خوش ہو گئے۔ بیوی سے کہا کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ، اور جو میرا مال ہے اس کی تم مالک ہو۔ یاروانصار سے کہا کہ جو میرے ساتھ آنا چاہے آئے۔ اب یہ میری آخری ملاقات ہے۔

جناب زہیرؓ کی بیوی کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی: مرحبا! زہیر ضرور جاؤ اور اپنے آپ کو فرزند رسولؐ پر قربان کرو، ایک وعدہ کرو میرے ساتھ۔ وہ یہ کہ جب قیامت کا دن ہو، اور حسینؑ کے ناناؐ کے سامنے جاؤ تو اس وقت کم از کم اتنی بات ضرور کہنا کہ اس نے مجھے کہا تھا کہ فرزندِ رسولؐ کی خدمت میں پہنچو، اس کے بعد زہیر کی بیوی اپنے گھر چلی گئی۔

زہیرؓ مولاؑ کے ساتھ رہے۔ کربلا میں پہنچے، ساتویں کو پانی بند ہوا۔ دسویں کے دن جب حسینؑ نے اجازت مانگی نماز کی، اور اجازت نہ ملی تو دو آدمیوں سے

آپ نے کہا کہ میرے سامنے کھڑے ہو جاؤ تا کہ میں اور میرے ساتھی نماز پڑھ لیں۔ ان میں سے ایک جناب سعیدؓ تھے اور دوسرے زہیرؓ تھے، جو تیر آتا تھا اسے اپنے جسم پر برداشت کرتے تھے۔

اور جب امام حسینؑ نے نماز ختم کی تو جناب سعیدؓ زمین پر گرے اور مولاؑ کی طرف دیکھ کر عرض کیا: مولاؑ! میں نے وفا کی ہے؟

فرمایا: بے شک تو نے وفا کی ہے۔

عزادارو۔۔۔۔!

اس کے بعد کچھ دیر حبیبؓ نے جنگ کی اور شہید ہو گئے۔ حبیبؓ کی بیوی نے اپنے مقام پر سوچا کہ اگر فرزندِ رسولؐ شہید ہو گئے تو اُمتِ رسولؐ ضرور ان کو کفن بھی پہنائے گی، دفن بھی کرے گی لہٰذا اس نے غلام کو ایک کفن دیا۔ کربلا میں جاؤ میرے شوہر کی لاش بے گوروکفن پڑی ہوگی اس کو جا کر کفن پہنا کر دفن کر دینا۔

لیکن جب کربلا میں وہ غلام آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ صرف زہیر کی لاش بے گوروکفن نہیں ہے بلکہ وہاں تو ۷۲ لاشیں بے گوروکفن پڑی ہوئی ہیں۔ جب یہ کیفیت دیکھی تو پلٹ کر گیا اور کفن واپس لے گیا۔

وہ خاتون کہنے لگی کہ کیوں تو نے کفن نہیں پہنایا؟

اس نے کہا کہ آپ کا حکم یہ تھا کہ زہیرؓ کو کفن پہناؤ لیکن میں نے تو دیکھا ہے کہ زہراؑ کا لال بھی بے گوروکفن پڑا ہے۔ لہٰذا میں کس طریقہ سے زہیرؓ کو کفن پہنا سکتا ہوں۔

●......●......●

مجلس چہارم

- خالقِ کائنات وہ ہے جس کا علم، جس کی قدرت اور جس کی تمام صفات غیر متناہی ہیں۔
- وہ طریقہ کار وہ راستہ جس پر چل کر اللہ کی عبادت کی جاسکتی ہے وہ اسلام ہے۔
- کوئی ایسا وقت ہو جس میں جزا و سزا یا حساب و کتاب لیا جاسکے تو جزا اور سزا ہوگی۔
- جہاں خدا کا تصور نہیں ہے اس کو لادین نظام کہا جاتا ہے۔
- دین وہی ہوگا جہاں خدا اور قیامت کا تصور ہو۔
- اسلام نام ہے تسلیم کا، سرِ تسلیم خم کرنے کا، ہر حکم کے سامنے جھک جانے کا۔
- ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔
- اگر اس ملک میں نظامِ اسلام آگیا تو پھر کیا ہوگا؟
- یہ مذہب، مذہب اسلام صرف زبانی جمع خرچ کا نام نہیں ہے۔
- یاد رکھو! خدا کو اس کی جنت کے بارے میں دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔

ذکرِ مصائب: حضرت حرؑ کی شہادت

- جس نے حسینؑ کے خیمے فرات کے کنارے نہیں لگنے دیئے تھے۔
- حرؑ کہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو جنت و جہنم کے درمیان دیکھ رہا ہوں۔
- لوگ کہتے ہیں کہ جی حرؑ نے کون سی نمازیں پڑھیں؟!

مجلسِ چہارم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ارشاد رب العزت ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (سورہ آل عمران، آیہ ۱۹)

"جو یقیناً اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے"۔

میں گذشتہ مجلس میں آپ سے یہ گزارش کر رہا تھا کہ ہماری گفتگو میں، ہمارے کلام میں اور خالق کائنات کے کلام میں، جہاں اور بہت سے فرق ہیں وہاں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ ہماری گفتگو سے ایک ہی مفہوم متکلم کے ذہن میں بھی آسکتا ہے اور سامع کے ذہن میں بھی آسکتا ہے۔

اور خالق کائنات جس کا علم، جس کی قدرت، جس کی تمام صفات غیر متناہی ہیں، لہٰذا اس کے کلام سے بیک وقت کئی مفاہیم اس کے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور کئی مفاہیم سمجھے بھی جاسکتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس آیت کو سرنامۂ کلام قرار دیا۔

عرض کیا تھا کہ لفظ دین کے تین معنی ہیں: جس میں دو معنی لغوی ہیں اور ایک معنی اصطلاحی ہے۔ ایک دین کا معنی ہے جزا اور ایک دین کا معنی ہے حساب۔

اور ایک معنی دین والوں کی اصطلاح میں وہ راستہ کہ جس پر چل کر اللہ کی عبادت کی جا سکے۔ اگر اس کا ترجمہ جزا کیا جائے تو مفہوم آیت کا یہ ہوگا کہ وہ چیز کہ جس پر جزا کا دارومدار ہے اور اگر اس کا معنی حساب و کتاب لیا جائے تو مفہوم یوں ہوگا کہ جس پر اسلام کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے وہ اسلام ہے اور اگر وہ اصطلاحی معنی لیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ وہ طریقہ کار وہ راستہ جس پر چل کر اللہ کی عبادت کی جا سکتی ہے وہ اسلام ہے۔

ایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ لفظ دین میں تمام اصولِ دین کا تصور پایا جاتا ہے، اس لیے کہ جب دین ہے وہ کہ جس میں جزا ہو، دین ہے ہی وہ جس میں حساب و کتاب ہو۔ قطع نظر اس کے اصطلاحی معنی کے، لغوی معنی کو بھی اگر مدنظر رکھا جائے اور جزا اور سزا اس میں رکھی گئی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ کوئی جزا و سزا دینے والا ہو تو جزا و سزا کا تصور ہوگا۔ اور کوئی ایسا عمل ہو کہ جس پر جزا و سزا رکھی گئی ہے تبھی وہ جزا ہوگی۔ کوئی ایسا وقت ہو کہ جس میں جزا و سزا یا حساب و کتاب لیا جا سکے تو جزا اور سزا ہوگی۔

اب ظاہر ہے کہ جس نے سزا دینی ہے جس نے حساب کرنا ہے وہ یا براہِ راست جن سے حساب لینا ہے یا جن کو جزا دینی ہے ان کو آ کر اپنے احکام بتائے، یا اس کے اور مخلوق کے درمیان کوئی ایسا نمائندہ ہو جو آ کر بتائے تو لہٰذا ایک اجمالی سا خاکہ لفظ دین میں، سارے اصولِ دین کا آ جاتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں خدا کا تصور ہے، اس اس نظام کو دین سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جہاں خدا کا تصور نہیں ہے اس کو لادینی نظام کہا جاتا ہے۔ ادیانِ عالم وہی ہیں کہ جو کسی نبیؑ کی طرف منسوب ہیں۔ جو کوئی نبی لے آیا۔ یہ

ٹھیک ہے کہ خود غرض لوگوں نے درمیان میں تحریفات کردیں۔ ان کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان میں گڑبڑ کی گئی۔

لیکن بہرحال ــــ!

بنیادی طور پر جب تک کسی نظام میں خدا کا تصور نہ ہو اس نظام کو دین نہیں کہا جاسکتا۔ دین وہی ہوگا جہاں خدا ہو اور قیامت کا تصور ہو۔

اور یاد رکھیے ــــ!

اگر قرآنِ مجید کا آپ مطالعہ کریں تو اصل بنیاد دین کیا ہے؟

خدا اور یومِ جزا۔ اس کو علمِ کلام کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے مبدأ و معاد۔ کہ ابتداء کہاں سے شروع ہوئی اور جانا کہاں تک ہے۔

اب ظاہر ہے کہ چونکہ خالق انتہاء کمال پر ہے اور ہم انتہا و پستی میں ہیں، لہٰذا براہِ راست ہمارا اس کے ساتھ تعلق نہیں ہوسکتا، اس لیے اس کے اور مخلوق کے درمیان ایسے واسطے ہونے چاہییں کہ جن کا تعلق اس کے ساتھ بھی ہو اور ہمارے ساتھ بھی ہو۔ تو اب اس گفتگو کے بعد دوسرے لفظوں میں قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے، جس پر جزا اور سزا رکھی جاسکتی ہے۔ وہ اسلام ہے۔ جس کی بنیاد پر حساب و کتاب ہوسکتا ہے۔ وہ اسلام ہے۔ وہ طریقہ کار، وہ راستہ جس پر چل کر اللہ کی عبادت کی جاسکتی ہے، وہ اسلام ہے۔

اب اسلام کسے کہتے ہیں؟ اسلام کے لغوی معنی دو ہیں: ایک ہے سرِ تسلیم خم کرنا اور دوسرا اسلام کا مفہوم ہے کہ اپنے آپ کو کسی کے سپرد کردینا، اور اصطلاحی طور پر بھی تقریباً یہی مفہوم بنتا ہے۔

پہلی منزل یہ ہے کہ تسلیم کیا جائے، یعنی اس نظام کو مانا جائے اور جب

ماننے میں شدت پیدا ہو تو پھر اپنے آپ کو سپرد کردو۔ اور یہی مفہوم جناب امیرالمومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اسلام کا بیان فرمایا ہے۔ جب آپ سے سوال کیا گیا کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

اَلْاِسْلَامُ هُوَ التَّسْلِيْمُ

''کہ اسلام نام ہے تسلیم کا، سرِتسلیم خم کرنے کا، ہر حکم کے سامنے جھک جانے کا''۔

اب یاد رکھیے ___!

کہ یہ اسلام جو دین ہے، ایک حصے کو اصولِ دین کہتے ہیں اور دوسرے حصے کو فروعِ دین کہتے ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے لازم وملزوم ہیں۔ اگر صحیح طور پر اصولِ دین کو کوئی شخص تسلیم کرتا ہے تو پھر اس کو فروعِ دین کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

یہ نہیں ہے کہ وہ کہے کہ اصولِ دین تو میں مانتا ہوں لیکن فروعِ دین نہیں مانتا۔ ہاں زبانی تو کوئی انکار نہیں کرسکتا لیکن عملی طور پر یہی ہوتا ہے کہ اصولِ دین کو تسلیم دنیا کرتی ہے لیکن فروع کو تسلیم کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ تو اب ان کا فروعِ دین پر عمل نہ کرنا اس بات کی دلیل بن جاتا ہے کہ گویا دل سے انہوں نے اصولِ دین کو تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے کہ اگر خدا کو خدا مان لیا، خدا کو عادل تسلیم کرلیا، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کو خدا کے نمائندے مان لیا، ائمہ اہلِ بیتؑ کو جانشینِ پیغمبر تسلیم کرلیا اور قیامت پر بھی یقین ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے مطابق انسان عمل نہ کرے۔ اور اگر عمل نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں نقص ضرور ہے۔ اس ماننے میں، اور اس لیے زبانی اقرار کو ایمان نہیں کہا گیا

قرآن میں۔

قرآن تو یہ کہتا ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا

"اے رسولؐ! عرب کے باشندے تمہارے پاس آ کر کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے"۔

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا

"اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے"۔

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (سورۂ حجرات، آیہ ۱۴)

"ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا"۔

وہ کلمہ پڑھتے تھے، خدا کو خدا مانتے تھے، رسولؐ کو رسول مانتے تھے ظاہری طور پر اور قیامت پر بھی یقین رکھتے تھے۔ جیسے ہم ہیں۔ اب احکام دو قسم کے ہیں: بعض ایسے ہیں کہ جن پر خرچ کچھ نہیں ہوتا، اور اکثر تو میرے جیسے ایسے بھی ہیں کہ جن پر کچھ لگتا نہیں ہے اس کو بھی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مثلاً نماز ہے۔

اب ظاہر ہے کہ نماز کی سہولت جتنی خالقِ کائنات نے دی ہے اگر اس کا تصور کیا جائے تو بنیادی طور پر جو نماز ہے صرف سترہ منٹ لگتے ہیں اس پر۔ مستحبات اگر آپ ادا نہیں کرتے تو وہ اور بات ہے۔ اگرچہ امام حسن عسکریؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"مومن کی علامات میں سے چار علامتیں ہیں:

ایک تو یہ ہے کہ وہ روزانہ اکیاون رکعت نماز پڑھتا ہے، گیارہ رکعت نماز تہجد ہے، دو رکعت مستحب ہے صبح کی، پھر دو رکعت واجب ہے صبح کی۔ اس کے بعد

آٹھ رکعت مستحب ہے ظہر سے پہلے، اور پھر چار رکعت ہے ظہر کی نماز، پھر آٹھ رکعت عصر کے نوافل، چار رکعت ہے واجب، اور اس کے بعد تین رکعت ہے مغرب کی اور چار رکعت ہے اس کے بعد مستحب۔ پھر عشاء ہے، اس کی چار رکعت واجب ہیں اور ایک رکعت ہے مستحب۔ بیٹھ کر پڑھیں تو دو اور کھڑے ہو کر پڑھیں تو ایک۔

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مومن کی علامت یہ ہے کہ ایک تو یہ کام کرتا ہو یعنی اکیاون (۵۱) رکعت نماز روزانہ پڑھتا ہو۔ دوسرا فرماتے ہیں کہ مومن کی علامت یہ ہے کہ وہ عقیق کی انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہنتا ہو۔ کچھ بائیں ہاتھ میں بھی پہنتے ہیں۔

تیسرا یہ ہے کہ وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے پڑھتا ہو۔ اور چوتھا یہ ہے کہ وہ اربعین یعنی چہلم کے دن امام حسینؑ کی زیارت پڑھے۔ وہاں کربلا جاسکے تو جائے یا جہاں کہیں ہے وہاں پڑھے۔

اب کوئی کہے کہ یہ تو اُونچے مومن کی علامت ہے تو کم از کم یہ نہیں کرسکتا تو واجب نماز تو پڑھے کیونکہ نوافل دگنے ہیں واجبات سے اور وہ بھی خدا یک وقت نہیں چاہتا۔ یعنی عجیب ہے کہ دو رکعت صبح کو پڑھو، چار ظہر کے وقت پڑھو اور چار عصر کے وقت پڑھو وغیرہ۔ باقی وضو پہ جو وقت لگتا ہے آخر آپ صبح کو اُٹھتے ہیں اور ہاتھ منہ دھوتے ہی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ذرا اس طرح دھو لو جس طرح میں کہتا ہوں۔ اسی طرح دوپہر کے وقت بھی انسان کاروبار سے تھک کر ہاتھ منہ دھوتا ہے تو وہ اس طرح دھو لے اور یہی کیفیت ہے شام کو۔

تو چونکہ خدا، رسولؐ اور آئمہؑ جانتے ہیں ہماری حالت کو، لہٰذا اگرچہ نماز

ظہر وعصر کے وقت کا فرق ہے۔ مغرب وعشاء کے وقت کا بھی فرق ہے لیکن ہمیں یہ اجازت دی گئی، چلو اکٹھا ہی پڑھ لیا کرو۔ اگر جماعت کے ساتھ پڑھو تو اس کا زیادہ ثواب ہے، علیحدہ علیحدہ پڑھنے سے زیادہ ثواب ہے۔ نماز کا ہوجانا علیحدہ ہے، کم از کم ہو جانے کی تو پڑھو۔

عموماً جو لوگ مجالس میں شریک ہوتے ہیں تو تجربہ یہی بتاتا ہے کہ نماز جاتی ہے تو جائے لیکن مجلس نہیں جانی چاہیے حالانکہ نماز اتنی اہم ہے کہ اصولِ دین کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور اس میں اصولِ دین کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً اصولِ دین میں یہ نہیں ہے کہ خدا کو آدھا دن تو مان لیا کرو اور آدھا دن نہ مانو تو کوئی فرق نہیں ہوتا، یا کسی وقت اس کو عادل مان لیا اور کسی وقت نہ مانا، یا سرکارِ رسالتؐ کو نبی کبھی کبھی مان لیا، کبھی کبھی نہ مانا۔ اسی طرح ائمہؑ اہلِ بیتؑ کو بھی۔ تو اسی طریقہ سے نماز بھی ہر دن پڑھیں اور پھر کسی حالت میں بھی نماز ترک نہیں ہوسکتی۔

یعنی یہ وہ عمل ہے کہ جو کسی بھی حالت میں ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے مثلاً کہتا ہے کہ نماز وضو کر کے پڑھو۔ اگر نہیں کر سکتے تو تیمم کر کے پڑھو۔ اگر پانی نہیں ملتا تو مٹی تو ملتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کھڑے ہوکر نہیں پڑھ سکتے تو کسی چیز کا سہارا لے کر پڑھو۔ عصا کے سہارے پڑھ لو، بیٹھ کر پڑھو، لیٹ سکتے ہو تو لیٹ کر پڑھ لو۔ دائیں کروٹ لیٹ کر پڑھو۔ اس طرح نہیں پڑھ سکتے تو بائیں کروٹ پڑھو۔ اس طرح نہیں پڑھ سکتے تو سیدھے لیٹ کر پڑھو۔ اب اگر بول سکتے ہو تو زبان سے پڑھو۔ نہیں بول سکتے تو دل سے بولو۔ رکوع وسجود کر سکتے ہو تو رکوع وسجود کرو۔ اگر نہیں کر سکتے تو اشارے سے کرو۔ اشارہ بھی نہیں کر سکتے تو آنکھ کے اشارے سے رکوع وسجود کرو۔ حتیٰ کہ یہاں تک کہ حکم ہے اگر کوئی شخص

دریا میں ڈوب رہا ہے اور اس نے نماز نہیں پڑھی تو جتنی پڑھ سکتا ہے پڑھ لے۔

اور یاد رکھو۔۔۔۔!

اگر اس ملک میں نظامِ اسلام آ گیا تو پھر کیا ہوگا؟ خدا کو ماننے میں جبر نہیں ہے، رسول کو ماننے میں جبر نہیں ہے، امامؑ کو ماننے میں جبر نہیں ہے۔ اصولِ دین میں جبر نہیں ہے، لیکن جب اس کو قبول کرلیا ہے تو فروعِ دین کے معاملے میں جبر ہے۔ جب اس حکومت کو آپ نے قبول کرلیا تو قوانین کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے، لہٰذا آپ نماز نہیں پڑھیں گے تو کوڑے لگیں گے۔ ایک نماز اگر کوئی شخص نہیں پڑھتا تو اس کی سزا ہے پچیس کوڑے، دو نہ پڑھیں تو پچیس کوڑے، پھر نہ پڑھے تو پچیس کوڑے۔ جب مسلسل چار نمازیں بغیر کسی عذرِ شرعی کے کوتاہی کرتا ہے تو بااتفاق علماء شیعہ واجب القتل ہے۔ جس کو ہم نے معمولی سمجھا ہوا ہے۔

اسی طریقہ سے روزہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر ایک روزہ کوئی شخص اگر بغیر کسی عذرِ شرعی کے نہ رکھے تو وہاں بھی وہیں پچیس کوڑے ہیں۔ علاوہ اس پچیس کوڑے کے وہ کہتا ہے کہ یا ایک غلام آزاد کرو، ایک روزے کے بدلے میں یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلاؤ، یا دو مہینے کے روزے رکھو اور وہ روزہ بھی رکھو یعنی اکسٹھ (۶۱) روزے ایک روزے کے بدلے میں۔

تو میرے دوستو۔۔۔۔!

یہ مذہب، مذہب اسلام صرف زبانی جمع خرچ کا نام نہیں ہے۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو اس کے احکام پر عمل کریں۔ اور یہ جو کہتے ہیں کہ نظامِ اسلام کیوں نہیں ہوتا۔ اصل میں جب تک کسی معاشرے کی تربیت نہ کی جائے اس وقت تک

کوئی نظام بھی صحیح طور پر نہیں چل سکتا۔ اصل یہ ہے کہ معاشرے کی تربیت کی جائے۔

ہر گھر میں ریڈیو موجود ہے۔ ہر گھر میں ٹیلی ویژن موجود ہے، جتنی فحاشیاں ہیں جو باپ بیٹی، ماں، سب حضرات دیکھتے ہیں۔ شرم و حیا کب ہے جب دین ہو۔ جب دین ہی نہیں ہے تو شرم و حیاء کس بات کا، تو اصلاً شرم و حیا ختم ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے گھر ہیں، سادات کے گھر ہیں، صوف کے ہیں، حجاج کے ہیں۔

تو دوستو۔۔۔۔!

دین عمل کا نام ہے۔ امیرالمومنین علی علیہ السلام بار بار نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

اَلْیَوْمُ عَمَلٌ وَّلَا حِسَابٌ وَغَدًا حِسَابٌ وَّلَا الْعَمَلُ

"یاد کرو آج عمل کے دن ہیں، عمل کرو"۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے علیؑ والو! میری مدد کرو، گناہ سے بچنے اور نیکی کی کوشش کرنے میں۔

وہی علیؑ یہ کہتے ہیں نہج البلاغہ میں: "یاد رکھو! خدا کو اس کی جنت کے بارے میں دھوکہ نہیں دیا جا سکتا"۔

اگر صرف زبانی طور پر خدا کو مان لیا، رسولؐ کو مان لیا، اہلِ بیتؑ کو مان لیا۔ اگر یہی کافی تھا تو یہ چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ اتنے مصائب، اعلامِ پیغمبرؐ پتھر کھا رہے ہیں، ان کے راستے میں کانٹے بچھائے جا رہے ہیں، ان کے ساتھ بائیکاٹ کیا جا رہا ہے۔ تو پھر اتنی زحمتیں اٹھانے کی کیا ضرورت

تھی۔

قرآن بار بار یہ کہتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

جہاں امنوا آیا وہاں عملوا ساتھ آیا ہے۔

تو بہرحال ــــ!

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عقیدہ کے ساتھ ساتھ عمل بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں نے ہمیشہ خدا کے دین کو بچانے میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ یزیدیوں نے آلِ محمدؐ کے ساتھ وہ ظلم کیا کہ پتھروں کو رُلا دیا۔ شیعہ و سنی کتابوں میں موجود ہے کہ تقریباً چالیس دن تک واقعۂ کربلا کے بعد جس پتھر کو زمین سے اٹھایا جاتا تھا اس سے خون اُبلتا تھا۔

اس لیے کہ جب سے دنیا بنی ہے اس وقت سے لے کر اس وقت تک کبھی ظلم کسی نبی پر ہوتا تھا، کسی مردِ صالح پر ہوتا تھا لیکن ایک پورا گروہ اللہ والوں کا کبھی بھی اتنا جمع نہیں ہوا جتنا کربلا میں جمع ہوا۔ جب سے دنیا آباد ہوئی ہے اس وقت سے لے کر آج تک اس قسم کا گروہ جمع نہیں ہوا۔ مرد تھے تو کامل الایمان تھے، عورتیں تھیں تو ان کی مثال نہیں ملتی تھی۔ چھوٹے بچے کربلا کے ایسے تھے کہ جن کی نظیر کہیں بھی نہیں۔ جنہیں جذبہ ہوتا ہے وہ اپنے ذوق سے عمل کرتے ہیں۔

ایک واعظ تھے انہوں نے بہت اچھی بات کہی کہ جب سے ذکرِ اہلِ بیتؑ پیشہ بن گیا اس وقت سے تبلیغ ختم ہوگئی۔ جس کو لفظ علامہ کا ترجمہ نہیں آتا وہ ہمارے علامہ بن گئے ہیں۔ اور اب تو ماشاء اللہ جب سے وی سی آر آیا ہے تو فلم

میں مندہ پڑ گیا ہے۔ جتنے قلم اشار تھے وہ سب ذاکر بن گئے ہیں تو کیا اہلِ بیتؑ کا گھر اس لیے اُجڑا، اس لیے تباہ ہوا، اصل مذہب شیعہ اور دوسرے میں فرق یہ ہے کہ منبر پر وہ بیٹھے جو اس کا اہل ہو۔ اصل لڑائی یہی ہے، جھگڑا یہی ہے اور اگر میں اہل نہیں ہوں تو مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں یہاں بیٹھوں۔

تو دوستو!۔۔۔۔ خدارا!! اپنے اُوپر رحم کرو۔

جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تمہارے نازک بدن میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ جہنم کی آگ کو برداشت کرسکو، لہٰذا بچاؤ اپنے نفسوں کو اور قرآن کہتا ہے:

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (سورۂ تحریم، آیت ۶)

"بچاؤ اپنے نفسوں کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے کہ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں"

ہاں! مایوسی توبہ کا دروازہ آج بھی کھلا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ کوئی صدقِ دل سے مانگے تو صحیح۔

ذکرِ مصائب: حضرت حرؑ کی شہادت

ابھی میرے عزیز مرثیہ پڑھ رہے تھے جو واقعۂ کربلا کا ذمہ دار ہے، جس کی وجہ سے ظاہراً واقعہ سودار ہوا۔ جس نے امام حسینؑ کے گھوڑے کی باگ پکڑی۔ جو آپ کو گھیر کر میدانِ کربلا میں لے آیا، جس نے حسینؑ کے خیمے فرات کے کنارے پر نہیں لگنے دیئے تھے اور جس کی گویا حراست میں یہ قافلہ کربلا کے میدان میں پہنچا۔

لیکن جب حق نمودار ہوتا ہے تو وہی حرؓ عمر ابن سعد سے جا کر کہتا ہے کہ اے عمر! تم کیا واقعی حسینؑ سے لڑو گے؟ یعنی گویا وہ یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ آخر کلمہ پڑھتے ہیں، مسلمان ہیں۔ نواسۂ رسولؐ سے لڑیں گے؟

تو عمر ابن سعد نے کہا کہ تم کیا سمجھتے ہو، آج ایسی جنگ ہوگی کہ سر اُڑیں گے اور بازو کٹیں گے۔

حرؓ کہتا ہے کہ کیا صلح نہیں ہوسکتی؟

کہنے لگا کہ نہیں امیر عبیداللہ ابن زیاد کو میں نے لکھا تھا مگر وہ نہیں مانا، تو جب وہاں سے مایوسی ہوئی تو پلٹا۔ ایک شخص اس کے گاؤں کا کہتا ہے کہ میرے پاس جب پہنچا تو کہتا ہے کہ تم نے اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا؟

کہنے لگا کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ حرؓ میدانِ جنگ سے بھاگ جانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اسے کوئی دیکھے نہیں۔ میں نے کہا: اچھا! ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں پانی پلانے۔

آگے تھوڑا بڑھا تو ایک اور شخص کہتا ہے کہ میں نے دیکھا حرؓ کانپ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے کہا: اے حرؓ! اگر مجھ سے کوئی سوال کرتا کہ اس میدان میں سب سے شجاع اور بہادر کون ہے تو میں تیرا نام لیتا۔ یہ تجھے کیا ہوگیا ہے۔ یہ کانپ کیوں رہا ہے؟

جب یقین کی منزل پر انسان پہنچتا ہے تو تب یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تو حرؓ کہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو جنت و جہنم کے درمیان دیکھ رہا ہوں۔ اِدھر جہنم اور اُدھر جنت۔ اور گھوڑے کو لے کر چلا اور میں نے بعض روایات میں دیکھا ہے کہ حرؓ نے اپنے چہرے پہ نقاب لے لیا۔ کس منہ سے حسینؑ کو ملے اور جا کر امام حسینؑ

کے قدموں پر جا کر اپنا سر رکھ دیا۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا: کون؟

کہا: وہی جس نے آپؑ کے گھوڑے کی باگ پکڑی، جو آپ کو مجبور کر کے یہاں لے آیا۔ جوان مصائب کا ذمہ دار ہے۔

مولاؑ! میں بہت بڑا گنہگار ہوں، کیا میرے جیسے گنہگار کی بھی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

امامؑ نے فرمایا: اے حُرؓ! اپنا سر اُٹھاؤ۔

قَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكَ

خدا نے تمہاری توبہ قبول کی ہے اور تیری ماں نے تیرا نام بڑا اچھا رکھا ہے۔ حُرؓ کا معنی ہے آزاد، واقعاً تو آزاد ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ جی حُرؓ نے کون سی نمازیں پڑھیں؟

بدبختو! اس نے ریاست چھوڑ دی، اس کو یہ پتہ نہیں ہے میری اولاد کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ اس نے اپنی ساری دنیا ترک کر دی۔ سب کچھ فدا کر دیا امام حسینؑ پر۔ تُو تو چار ٹکے دینے کے لیے نہیں اور کہتا ہے کہ حُرؓ نے کیا کیا۔

حُرؓ نمازیں بھی پڑھتا تھا، حُرؓ وہی ہے کہ جس نے سب سے پہلے حسینؑ کے پیچھے نماز پڑھی اور بعید نہیں ہے کہ اسی نماز کا اثر ہو کہ جس کی وجہ سے اس مقام پر پہنچا۔

ایک رات جناب سید سجاد علیہ السلام نے دیکھا کہ جنابِ زینبؑ نمازِ تہجد بیٹھ کر پڑھ رہی تھیں، اسی واقعۂ کربلا کے بعد۔ بیٹھ کر نماز پڑھ رہی ہیں تو پوچھا:

پھوپھی اماں! کیا بات ہے؟ آپ نماز تہجد بیٹھ کر پڑھ رہی ہیں؟

کہا: بیٹا کھانا اور پانی اتنا کم آتا ہے کہ میرے بھائی کے چھوٹے بچے بھی سیر نہیں ہو پاتے لہٰذا میں اپنے حصے کا کھانا ان بچوں کو دے دیتی ہوں۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے۔

عزادارو ــــــ!

آپ تصور نہیں کر سکتے کہ سادات پر کیا گزری۔ درمیان میں سال، ڈیڑھ سال کا ہی عرصہ تھا جب کربلا سے چلے اور شام تک گئے اور شام سے واپس آئے تو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال کا وقفہ ہے۔

وہ عورتیں، وہ خواتین جنہوں نے جناب زینبؑ کے ساتھ زندگی بسر کی تھی اسی زینبؑ سے آ کر پوچھتی تھیں کہ علیؑ کی بیٹی کہاں ہے؟ بھائی جناب محمد حنفیہ وہ جناب زینبؑ کو نہیں پہچان سکے۔

بلکہ ایک روایت مشہور ہے کہ جو بعض کتب میں موجود ہے کہ جناب عبداللہ نے بیمار کربلا کی خدمت میں عرض کیا: چونکہ جب مدینہ میں واپس آئے تھے تو لوگ پُرسہ دینے آتے تھے تو فراغت نہ مل سکی۔ تو جناب عبداللہ نے کہا: پھوپھی سے کہو کہ وہ اپنے گھر تشریف لے آئیں۔ تب جناب زینبؑ گئیں۔

اولاد والو! اب خود اندازہ لگاؤ کہ جو گھر کبھی آباد ہو اور اب اس پر خاک اڑ رہی ہو، اور وہ گھر ویران پڑا ہو، اس ماں کے دل پر کیا گزری ہوگی لہٰذا اس گھر میں جا کر ایک کونے میں بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ جناب عبداللہ جب گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک خاتون رو رہی ہے۔

جناب عبداللہ نے کہا کہ اے بی بی! یہ تو زینبؑ کا گھر ہے۔ اب آپ

اندازہ لگائیں کہ جناب زینبؑ کے دل پر کیا گزری ہوگی۔

کہا: عبداللہ آپ بھی نہیں پہچان سکے۔ تو اس کے بعد جناب عبداللہ ایک فقرہ کہتے ہیں:

بی بی! کچھ زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا۔ کیا وجہ ہے کہ آپؑ کی آنکھیں اندر دھنس گئیں، آپؑ کے بال سفید ہوگئے، آپ کی کمر جھک گئی ہے۔

جناب زینبؑ کہتی ہیں کہ اے عبداللہ! یہ تو جانتے ہو کہ اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ ٹھیک ہے کہ جب میرے بچے آئے میں روئی نہیں ہوں لیکن میری آنکھیں ضرور دھنس گئیں اور جب علی اکبرؑ کو برچھی لگی تو حسینؑ کے بھی بال سفید ہوگئے اور زینبؑ کے بال بھی سفید ہوگئے اور جب عباسؑ کے بازو کٹے تو حسینؑ نے کہا: اب میری کمر ٹوٹ گئی ہے تو حسینؑ کی کمر بھی جھک گئی اور زینبؑ کی کمر بھی جھک گئی۔

بس عزادارو ـــــ!

ایک فقرہ کہتا ہوں وہ کہ پانچ سال تک سادات کے گھروں سے کسی نے دھواں اُٹھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب تک قاتلانِ حسینؑ کے سر، عبیداللہ بن زیاد اور عمر بن سعد وغیرہ کے سر مختار نے نہیں بھیجے۔

جب سر بھیجے ہیں سید سجاد علیہ السلام کے سامنے پیش کیے گئے اور ظاہر ہے کہ سید سجاد علیہ السلام کو یقیناً ایک ڈھارس ہوئی ہوگی۔ سروں کو لانے والا یہ کہنے لگا کہ مختارؒ یہ کہہ رہا تھا کہ میری ایک آرزو ہے خواتینِ عصمت سے۔ میں نے آپ کے باپ کے جتنے قاتل تھے، آپ کے عزیزوں کے جتنے قاتل تھے ان کے سر قلم کردیے ہیں تو اگر اس کا کوئی اجر ہوسکتا ہے تو میں ایک سوال کرتا ہوں وہ یہ کہ

بیبیوں سے کہو کہ اب وہ اپنے سروں کو دھولیں۔

اس لیے کہ آپ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ جن کے گھر اُجڑے ہوئے تھے، نہ بیٹے رہے، نہ بھائی رہے، نہ شوہر رہے۔ اُجاڑ ہی اُجاڑ تھا اور رات دن اگر کام تھا تو رونے کا تھا اور انہی میں ایک وہ بی بی تھی کہ جس نے حسینؑ کی لاش کو ریت گرم پر دیکھا تھا اور اپنے وارث کی لاش پر کھڑے ہو کر وعدہ کیا تھا کہ زہراؑ کے لال! آپ کی لاش کو میں ریت گرم پر دیکھے جا رہی ہوں، جب تک زندہ رہوں گی کبھی سایہ میں نہیں بیٹھوں گی۔

آپ جانتے ہیں کہ وہ کون خاتون ہے؟

وہی جس کی کربلا میں جھولی خالی ہو گئی تھی، جس کا چھ ماہ کا بچہ پانی نہیں پی سکا تھا۔ وہی رباب تھی جس نے ساری زندگی دھوپ میں گزاری۔

●......●......●

مجلس پنجم

- جتنی معرفت خالق دوجہاں کے بارے بڑھے گی، اتنا ہی باقی اصول دین کے بارے خلوص پیدا ہوگا۔
- کوئی ایسا رنگ نہیں ہے کہ جو خالق کائنات نے اس کے پروں پر نقش نہ کیا ہو۔
- یہ ایک مضبوط قلعہ ہے جس میں کوئی سوراخ نہیں ہے، نہ باہر سے کوئی اندر جاسکتا ہے اور نہ اندر سے کوئی باہر آسکتا ہے۔
- نہ سونے والا دریا چاندی سے ملتا ہے اور نہ چاندی والا سونے میں ملتا ہے۔
- ہم گروہ انبیاءؑ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔
- اس کائنات کے بنانے والے کے وجود کی کیا دلیل ہے؟
- دنیا سمجھتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔
- اگر انسان کا خدا کے ساتھ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو تو پھر انسان مخلوق خدا کو تنگ نہیں کرتا۔
- انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی وہ سعی و کوشش کرے گا۔

ذکرِ مصائب

- دربار یزید اور بی بی زینبؑ

مجلسِ پنجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارشادِ رب العزت ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (سورہ آل عمران، آیہ ۱۹)

"جو یقیناً اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے"۔

ارشادِ ربانی ہے کہ یقیناً دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔

عرض کیا کہ دین کے دو حصے ہیں: ایک اصول اور ایک فروع۔ پھر اصول کی بنیاد توحید پروردگار عالم ہے اور جتنا یقین، جتنی معرفت خالق دوجہان کے بارے بڑھے گی، اتنا ہی باقی اصولِ دین کے بارے میں خلوص پیدا ہوگا۔

اگر کوئی بھیجنے والا ہے تو کسی کو بھیجا بھی گیا ہے۔ اگر اس بھیجنے والے کا ہی یقین نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے نمائندوں کے متعلق یقین کیسے پیدا ہوگا۔

لہٰذا سب سے زیادہ خدائی نمائندوں میں انبیاءؑ ہیں اور قرآن مجید کی سیکڑوں آیات میں یہ مفہوم ملے گا کہ اللہ کے جتنے نبی آئے، ہر ایک نبیؑ نے آکر خدا کا پیغام پہنچایا اور اسی کو ہی بنیاد قرار دیا گیا۔

ہمیں اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ قرآن مجید، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے ارشادات اور خصوصیت کے ساتھ نہج البلاغہ کا زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے۔

جناب امیرالمومنینؑ نے مختلف خطبات میں توحید کے بارے میں اور ہر چیز کے بارے میں بتایا حتیٰ کہ ایک خطبہ حضرت طاؤوس کے بارے میں یعنی مور کے بارے میں ہے۔ تو اس میں آپ فرماتے ہیں کہ کوئی ایسا رنگ نہیں ہے کہ جو خالق کائنات نے اس کے پروں پر نقش نہ کیا ہو۔ اور پھر یہ ہے کہ ہر سال اس کے پَر گر جاتے ہیں۔ گرنے کے بعد پھر جب دوبارہ نکلتے ہیں تو جہاں پہلے رنگ تھا دوسری مرتبہ بھی اسی جگہ وہی رنگ نقش ہوتا ہے۔ رنگوں میں فرق نہیں آتا۔

اسی طریقہ سے جناب صادق آل محمدؑ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا کہ خدا کے وجود کی کوئی دلیل پیش کیجیے۔ تو اتفاق سے ایک بچہ وہاں ایک انڈے سے کھیل رہا تھا۔ تو آپؑ نے وہ انڈا اُٹھا لیا اور ارشاد فرمایا کہ یہ ایک مضبوط قلعہ ہے جس میں کوئی سوراخ نہیں ہے، نہ باہر سے کوئی اندر جا سکتا ہے اور نہ اندر سے کوئی باہر آ سکتا ہے کہ جس نے خبر دی ہو کہ اس میں کیا ہے۔

پھر فرمایا کہ اس میں دو دریا بہہ رہے ہیں۔ اس قلعہ کے اندر دو دریا بہہ رہے ہیں۔ ایک سونے کا ہے، ایک چاندی کا ہے، فاصلہ بھی نہیں ہے، نہ سونے والا دریا چاندی سے ملتا ہے اور نہ چاندی والا سونے میں ملتا ہے...... (صلوٰۃ)

اب ہر انڈے میں یہی ہے، ایک پانی ہے سونے کے رنگ کا اور ایک پانی ہے چاندی کے رنگ کا۔ اب اس سے جو بچے پیدا ہونے چاہئیں اصولی طور پر، اگر ایک کارخانہ نے بنایا ہے اور اس میں مواد ایک قسم کا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ چیز دو رنگوں کی نہیں ہوگی بلکہ وہ ایک ہی رنگ کی ہوگی۔ مختلف رنگوں کی تو نہیں ہوتی

چاہیے۔ لیکن یہ قلعہ جو خالق کائنات نے بنایا ہے اس میں جب بچے پیدا ہوتے ہیں تو وہ مختلف جنسوں کے، مختلف نوعوں کے پیدا ہوتے ہیں۔ شکل و شباہت سب کی ایک، کسی انڈے سے مرغی نکلتی ہے، کسی سے مور نکلتا ہے، کسی سے کچھ اور چیز نکلتی ہے۔ پھر ان کے بھی آپس میں رنگ مختلف ہیں۔

تو وہ کون ہے جو اس سفید قلعے میں جہاں سوراخ نہیں ہے، جہاں کوئی راستہ نہیں ہے، کون ہے جو اس کے اندر یہ نقش و نگاری کرتا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی ارشاد ہے:

نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِیَاءِ نُکَلِّمُ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُولِهِم

''ہم گروہ انبیاءؑ لوگوں سے گفتگو ان کی عقلوں کے مطابق کرتے ہیں''۔

تو لہٰذا جہاں پڑھے لکھے لوگ آتے تھے، سمجھ دار آتے تھے ان کو اور قسم کی دلیلیں دی جاتی تھیں، جیسا کہ نہج البلاغہ کے آپ خطبات پڑھیں، تو دقیق سے دقیق ترین ادلہ موجود ہیں۔ سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہے، فکر کی ضرورت ہے۔

جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں ایک بدو، ایک دیہاتی آیا تو اس کے مزاج کے مطابق ایک سادہ سے سادہ جو اس کی سمجھ میں آجائے، اس نے کہا:

مَا الدَّلِیْلُ عَلٰی صَانِعِ الْعَالَمِ

''اس کائنات کے بنانے والے کے وجود کی کیا دلیل ہے؟''

تو آپؑ نے فرمایا کہ اگر آپ جنگل میں جائیں اور اُونٹ کی مینگنیاں تمہیں مل جائیں۔ تو کیا تمہیں یقین نہیں پیدا ہوتا کہ یہاں سے کوئی اُونٹ گزرا ہے؟ یا

کسی اور جانور کا گوبر تمہیں مل جائے وہ یہ نہیں بتاتی کہ یہاں سے کوئی جانور گزرا ہے۔ اور اگر کسی انسان کے پاؤں کا نقش مل جائے تو کیا تمہیں یقین پیدا نہیں ہوتا کہ یہاں سے کوئی انسان گزرا ہے۔

کہنے لگا: کیوں نہیں۔

تو فرمایا کہ جب ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے تمہیں یقین ہوتا ہے کسی کا، تو اتنا بڑا عالم، اور اتنی بڑی کائنات کیا اس سے تجھے یقین نہیں پیدا ہوتا کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے۔

تو بہرحال ـــــ!

میں نے تو چھوٹے چھوٹے نمونے آپ حضرات کے لیے خصوصاً بچوں کے لیے پیش کیے کہ یہ چیزیں آپ کے ذہن میں آجائیں تو خلاصہ توحید کا یہ ہے کہ ایک ذات ہمیشہ سے ہے۔ یہ بات سمجھ لیجیے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ایک قدیم ہے اور جو خدا کے ماننے والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا قدیم ہے اور جو خدا کو نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ مادہ قدیم ہے جس کو وہ ایٹم سے تعبیر کرتے ہیں۔

تو بہرحال ـــــ!

قدیم میں کسی کا اختلاف نہیں۔ کیونکہ پہلے سے اگر کوئی موجود نہ ہو تو عدم سے کوئی وجود میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا قہراً انہیں بھی ماننا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مادہ ہمیشہ سے ہے یا ہندو ہیں وہ کہتے ہیں کہ تین چیزیں قدیم ہیں: ایک روح قدیم ہے، ایک مادہ قدیم ہے، ایک خدا قدیم ہے لیکن عموماً جو دہریہ ہیں جو عموماً خدا کو نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ مادہ قدیم ہے۔ یہ خود بخود مختلف شکلیں اختیار کرتا

ہے۔ تو ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایک قدیم ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اگر ایک قدیم نہیں ہے تو اس دنیا کا وجود ہی نہیں ہے کیونکہ خود بخود عدم سے کوئی وجود میں نہیں آ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے بھی ایک قدیم کو مانا۔

اب یہ ہے کہ وہ شکلیں خود بخود بدلتا ہے۔ تو ہم یہ کہتے ہیں کہ آیا یہ کائنات با مقصد ہے یا بے مقصد ہے۔ اگر تو ہے بے مقصد تو پھر مادہ قدیم ہے۔ کسی چیز کے وجود کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ اگر کسی چیز کا کوئی مقصد نہیں تو پھر یہ آنکھیں بھی بیکار ہیں، یہ کان بھی بیکار ہیں۔ یہ اعضاء و جوارح بھی بیکار ہیں۔ یہ رات دن بھی بیکار ہے، یہ درخت بھی بیکار ہیں۔ سب کچھ بیکار ہے کیونکہ جو خود بیکار ہے تو وہ جس چیز کو پیدا کرے وہ بھی تو بیکار ہی ہو گی۔ جو خود نہیں کر سکتا، نہ علم رکھتا ہے، نہ حکمت ہے، نہ دانائی ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ پھر جو چیز بھی اس سے بنے گی وہ بے مقصد ہو گی، تو وجود بھی بے مقصد ہو گا۔

اگر اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ساری کائنات بے مقصد ہے تو پھر ٹھیک ہے خدا کو نہ مانو، اور اگر کہتے ہو کہ نہیں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بے مقصد ہو ہر چیز میں مقصدیت موجود ہے اور سائنس اسی بات پر لگی ہوئی ہے کہ فلاں چیز میں کیا فوائد ہیں، کیا نقصانات ہیں؟ کس طریقے سے وہ بنی ہے۔ تحقیق صرف اس بات پر ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے اس سے ہم کس طرح فائدہ اٹھائیں۔

اور اسی کائنات سے کتنے فوائد دن بدن دنیا اُٹھا رہی ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ دنیا سمجھتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ اگر ہے تو پھر

کوئی ایسا ہے کہ جس نے ہر چیز کو مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔

اب یہ کہ وہ خود کیسا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ایسا ہے کہ جیسا کوئی نہیں۔ کیونکہ خالق اور مخلوق ایک جیسے نہیں ہو سکتے لہٰذا مخلوق کو اس سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ کیوں؟ یہاں احتیاج ہی احتیاج ہے وہ استغناء ہی استغناء ہے۔

تو احتیاج کا قیاس استغناء پر نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جو ہر عیب سے پاک ہے، نہ وہ جسم ہے، نہ جسمانیات میں سے ہے، نہ وہ متحرک ہے، نہ وہ سکون میں ہے۔

ایک دہریہ نے جناب صادق آلِ محمدؑ سے عرض کیا کہ جب ہم غور کرتے ہیں اس پر کہ وہ سمجھ میں نہیں آتا تو ہم انکار کر دیتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا کہ ہم جب غور کرتے ہیں اور وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو ہم اقرار کرتے ہیں۔

اسی لیے ایک جگہ امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ جو ذہن میں تم تصور کرتے ہو، کہ ایسا ہوگا، ایسا ہوگا تو وہ تمہاری مخلوق ہے۔ وہ تمہارے ذہن کی اختراع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے نمائندے بھیجے، جو جو الفاظ، جو جو صفات انہوں نے بتائیں کہ ان ان صفات کا وہ مالک ہے۔ بس تمہارا حق یہ بنتا ہے کہ انہی صفات کا اقرار کرلو۔ اس کی ذات میں غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی مخلوق پر غور و فکر کرو، ایک اس کے صفاتِ کمال میں سے جو امتیازی شان رکھتی ہے، اور چنانچہ مذہبِ حقہ میں اس کو اصولِ دین کا ایک جز قرار دیا گیا ہے، وہ توحید کے بعد عدل ہے۔

عدل کا معنی کیا ہے؟ ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ عدل اور ظلم دو چیزیں ہیں۔ ظلم کا معنی یہ ہے کہ:

وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهِ
"کسی چیز کو اس کی جگہ پر نہ رکھا جائے"۔
یہ ظلم ہے۔ اور ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا یہ عدل ہے۔

ہم میں عادل وہ ہے کہ وہ واجبات کو واجب ہونے کی حیثیت سے ادا کرے۔ مستحبات کو مستحب ہونے کی حیثیت سے ادا کرے۔ حرام کو حرام ہونے کی بنا پر ترک کر دے۔ مکروہ کو مکروہ ہونے کی بنا پر ترک کرے۔

جب خدا کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ خدا عادل ہے، تو اس کے تین مصداق ہیں: ایک اس کا مصداق یہ ہے کہ اس نے یہ کائنات اعتدال پر خلق کی ہے۔ یعنی ہر چیز کو، جہاں اس کا مقام تھا اسی مقام پر اس کو رکھا۔ ایک مفہوم، مصداق عدل کا اس کے ہاں یہ ہے۔

دوسرا یہ ہے کہ جتنے اس نے احکام بندوں کے لیے بنائے ہیں، احکام یعنی شریعت، وہ عدل پر مبنی ہیں۔ باپ بیٹے کے حقوق کو ادا کرے، بیٹا باپ کے حقوق کو ادا کرے۔ بیوی شوہر کے حقوق کو ادا کرے۔ شوہر بیوی کے حقوق کو ادا کرے۔ مومن مومن کے حقوق کو ادا کرے۔ مسلمان مسلمان کے حقوق کو ادا کرے، ہمسایہ ہمسائے کے حقوق کو ادا کرے تو یہ دنیا کا جتنا فتنہ اور فساد ہے یہ سب کا سب ختم ہو جائے گا۔

اصل میں یہ ہے کہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سے فساد برپا ہوتا ہے۔ لیکن اگر حکمِ خدا کے مطابق جس طرح اس نے ہر ایک کے حقوق معین کیے ہیں، ان پر عمل کیا جائے۔

ارشادِ قدرت ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (سورۂ اعراف، آیہ ۹۶)

''کہ اگر شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو آسمانوں اور زمین کی برکتیں ان پر نازل ہوں''۔

خدا کا یہ وعدہ ہے، یہ آفتیں، مصیبتیں، تکلیفیں جو آئی ہیں عموماً، اور وہ بہت کم لوگ ہیں کہ ان پر کوئی تکلیف صرف ان کے امتحان کی وجہ سے آتی ہے، واللہ اکثر اوقات جن لوگوں پر تکلیفیں آتی ہیں وہ ان کا اپنا کیا ہوا سامنے آتا ہے۔

مثلاً ہم بیمار ہوتے ہیں تو کیوں ہوتے ہیں؟ ہماری یہ بیماریاں ہماری بے اعتدالیوں کی وجہ سے ہیں۔ اگر ہم ہر کام میں اعتدال سے کام لیں، تو بیمار نہ ہوں۔

تو جس زمانے میں لوگ معتدل غذائیں کھاتے تھے، سادہ غذا کھاتے تھے، کام ٹھیک ٹھاک کرتے تھے تو بیماریاں کم ہوتی تھیں۔ ان کی عمریں طویل ہوتی تھیں۔ اب جب سے آسائش و آرام زیادہ ہوگئے ہیں۔ پنکھے سے باہر آپ جا نہیں سکتے اور جو زیادہ امیر لوگ ہیں وہ A.C سے باہر جا نہیں سکتے۔

تو ظاہر ہے کہ جو فاضل مادے ہیں وہ پسینے کے ذریعے باہر تو نہیں نکل سکتے، باوجود اس کے کہ لاکھوں کروڑوں کے مالک ہیں۔ کھانے سے بیمار ہوگئے ہیں۔ نہ کچھ کھا سکتے ہیں، نہ کچھ پی سکتے ہیں۔

ائمہؑ اور پیغمبرؐ اسلام وہ خود اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے لیکن ہم لوگ تو عیب سمجھتے ہیں۔ ہم لوگ تو قبلہ و کعبہ ہیں، ہم کوئی کام کیوں کریں۔ کیا تم

پیغمبرِ اسلام سے بڑھ کر ہو۔ حتیٰ کہ آئمہ معصومینؑ کھیتوں میں کام کرتے تھے۔

اب بھی جو لوگ مدینے میں جاتے ہیں وہ مسجد شجرہ (جہاں سے احرام باندھا جاتا ہے) اس کے قریب اب بھی چار کنویں ہیں، جن کو علیؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یعنی علیؑ کے کنویں یعنی جناب امیرؑ نے خود اپنے ہاتھ سے کنویں کھودے، اور ایسے کنویں کئی کھودے۔ اس زمانے میں تو یہی ہوتا تھا کہ کنواں ایک کھودا اور اس کے گردونواح کی زمین اسی سے آباد ہوتی تھی۔ نامعلوم کتنے کنویں جناب امیرؑ نے کھودے؟ اور پھر وہ وقف کر دیتے تھے غرباء پر، مساکین پر، دوسرے لوگوں پر۔

یہ نہیں تھا کہ جو ہم سنتے رہتے ہیں کہ تین تین دن تک فاقے کیے ہیں۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ جناب امیر المومنینؑ کی زراعت کی آمدنی چالیس ہزار دینار تھی۔ (نعرۂ حیدری)

ایک دفعہ میں ایک مولوی صاحب سے کہہ رہا تھا کہ دو قومیں خدا کا کبھی شکر نہیں کرتیں۔ ایک تو ہم مولوی اور دوسرا تاجر۔ جس مولوی سے پوچھ لو وہ کہتا ہے کچھ نہیں۔ اور کسی تاجر سے پوچھ لو تو وہ کہتا ہے کہ مندہ ہے۔

— حالانکہ ضروریاتِ زندگی انتہائی مختصر ہیں۔ دو روٹیاں اور پانی، دو روٹیوں پر پیسے خرچ ہوتے ہیں، پانی پر نہیں ہوتے۔ لباس بھی سادہ پہن لے، مکان بھی، اب اگر ایک آدمی کی پانچ افراد کی فیملی ہے تو زیادہ سے زیادہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دو کمروں والا مکان ہونا چاہیے۔

تو اگر انسان کا خدا کے ساتھ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو، تو پھر نہ انسان مخلوقِ خدا

کو تنگ کرتا ہے نہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتا ہے، بلکہ مخلوقِ خدا کی خدمت کرتا ہے۔ بقول ایک شاعر کے کہ

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

اس کو کوئی لمبی چوڑی اطاعت کی ہماری ضرورت نہیں۔ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ ہم میں انسانیت کتنی ہے۔ اگر ہم میں انسانیت آجائے، عدالت آجائے، پھر ہم فرشتوں سے بھی افضل ہیں۔ اس لیے کہ انسان میں خواہشاتِ نفسانی موجود ہیں۔ ان میں تو نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر وہ گناہ نہیں کرتے تو وہ تو بیچارے گناہ کر ہی نہیں سکتے، نہ ان کو کھانے کی ضرورت، نہ پینے کی ضرورت، نہ بیوی، نہ گھر بار، نہ کسی پر حسد، نہ کسی سے بغض، نہ جھگڑا۔

لیکن اگر انسان ان سب چیزوں کو اعتدال پر رکھے تو پھر فرشتے آکر اس کو سلام کرتے ہیں۔

تو میں نے عرض کیا کہ دوسرا یہ کہ خدا عادل ہے، کا معنی کیا ہے کہ اس کے سب احکام اعتدال پر ہوتے ہیں۔ اور تیسرا مصداق اس کا یہ ہے کہ اس نے جن اعمال کی جزا مقرر کی ہے۔ نماز پڑھو گے، روزہ رکھو گے، حج کرو گے، زکوٰۃ دو گے، خمس دو گے، تو اتنا ثواب دوں گا۔ اب عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں کمی نہیں ہوگی۔ زیادتی ہوسکتی ہے۔ وہ اس کا کرم و فضل ہے لیکن اس سے کمی نہیں ہوسکتی۔

اور جن اعمال کی اس نے سزا مقرر کی ہے، جتنی سزا مقرر کی ہے اتنی ملے گی، اس سے زیادہ سزا نہیں ہوسکتی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ معاف کردے بلکہ وہ کہتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا (سورۂ زمر، آیہ ۵۳)

"اگر توبہ کرو تو سب گناہ معاف کردوں گا مگر یہ کہ خدا کا اگر کسی کو شریک قرار دو تو یہ گناہ معاف نہیں ہوگا"۔

تو آپ کے پاس تو چودہ ایسی ہستیاں موجود ہیں جو ہر مرحلے میں آپ کی شفاعت کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ہم اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ وہ کل کہیں کہ یہ ہمارے ہیں۔

اب تو ہم کہتے ہیں کہ ہم ان کے ہیں، لطف تو جب ہے کہ وہ کہیں کہ یہ ہمارے ہیں۔ جب وہ یہ کہیں گے کہ یہ ہمارے ہیں۔ پھر کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اپنے میں استطاعت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے:

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (سورۂ نجم، آیت ۳۹)

"انسان کو وہی کچھ ملے گا جو وہ سعی و کوشش کرے گا"۔

یوں نہ ہو کہ جنابِ امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ آج عمل کی دنیا ہے، حساب دینے والا کوئی نہیں ہے اور کل حساب دیا جائے گا، وہاں گنجائشِ عمل کی نہیں ہوگی۔

ذکرِ مصائب: دربارِ یزید اور بی بی زینبؑ

یہ جو تھے کربلا والے ان کے بھی گھر تھے، ان کے بھی رشتہ دار تھے، ان کے بھی بیوی بچے تھے۔ سب کچھ تھا لیکن انہیں جب موقع ملا تو اپنا سب کچھ دین پر قربان کر دیا۔

اور وہ سارے سیّد نہیں تھے، وہ سب خاندانِ رسالتؐ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، لیکن کتنی بڑی عظمت انہیں ملی کہ امامِ معصوم جب زیارت ان کی پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں:

بِاَبِیْ اَنْتُمْ وَ اُمِّیْ

"میرے ماں باپ تم پر صدقے ہو جائیں"۔

تم خود بھی پاک ہوئے اور تمہاری وجہ سے وہ زمین بھی پاک ہوگئی جس میں تم دفن ہوئے۔

انسان چار دن دنیا میں زندگی گزارتا ہے اگر اس کی زندگی اللہ کے لیے ہے، ہم سب کو افسوس ہے کہ قائدِ محترم اسی دنیا سے عالمِ شباب میں ابھی اکتالیس سال کی عمر تھی ان کی اور اس دنیا سے چلے گئے۔ ابھی ان کی داڑھی کا کوئی بال سفید نہیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ قوم کے لیے عظیم سانحہ ہے ان کی موت اور ان کے خاندان والوں کے لیے۔

لیکن ان کی عمر علی اکبرؑ سے تو زیادہ تھی۔ قاسمؑ سے تو زیادہ تھی اور سب سے چھوٹا شہید تو علیؑ اصغر تھا جو چھ ماہ کا بچہ تھا۔ وہ ان میں شریک ہے اور جو عمل کربلا کی خواتین نے پیش کیا ہے کہ خدا کی قسم! عقلِ انسانی حیران ہو کر رہ جاتی ہے۔

خاندانِ بنی اُمیہ یہ سمجھتا تھا کہ ہم نے اہلِ بیتؑ کے مردوں کو شہید کر دیا۔ اب بچے اور عورتیں رہ گئی ہیں، پھر ایک طویل سفر۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ کبھی اُونٹ کی سواری کریں تو علم ہو اور اگر وہ اُونٹ بے پالان نہ ہو تو اس پر سواری کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

پھر سواری کوئی دس بیس میلوں کی نہیں تھی بلکہ سیکڑوں میلوں کی تھی۔ بے مقنع و چادر، بے پالان اُونٹ، چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ۔

لہٰذا اسی طویل سفر میں وہ ملاعین یہ سمجھتے تھے کہ یہ تھک چکے ہیں۔ اب جو

کچھ ہم چاہیں کہیں یا کریں تو کوئی ہمیں جواب دینے والا نہیں ہے۔

چنانچہ جب یہ تھکا ہوا قافلہ اور اس قافلے کی تھکی ہوئی سپاہ سالار عموماً ذاکرین بیان کرتے ہیں کہ تین میل شام باقی تھا کہ حکم آیا کہ بیبیوں کو پیدل چلایا جائے، لیکن شیخ عباس قمی صاحب مفاتیح الجنان جن کی ایک ایک کتاب منتہی الآمال کا میں نے ترجمہ کیا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ نہیں تین میل نہیں تھے بلکہ تو فرسخ تھے۔ تو فرسخ شام ابھی دور تھا جو کم و بیش تیس میل بنتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے بچے، مستورات، ان کو کم و بیش ۳۰ میل چلایا گیا۔ اب آپ اندازہ لگایئے کہ جو تھکے ہوئے بھی تھے اور بھوکے بھی تھے۔ پیاسے بھی تھے لیکن ایمان کی کتنی قوت تھی ان میں کہ جب یزید کے دربار میں یہ تھکی ہوئی بیبیاں پہنچیں تو اس لعین نے اپنی فتح اور کامرانی کے گھمنڈ میں خطبہ دیا اور اس لیے میں نے کہا کہ احد و بدر کے میرے مارے جانے والے ہوتے تو وہ آ کر مجھے مبارک باد دیتے کہ میں نے آلِ احمدؐ سے ان کے بدلے لے لیے۔

پھر کہنے لگا کہ یہ تو بنی ہاشم نے ایک کھیل کھیلا تھا۔ نہ کوئی وحی آئی تھی اور نہ کوئی فرشتہ آیا تھا۔ یہ تو ایک ڈھونگ تھا۔ دین کا انکار کر رہا تھا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کو ٹوک سکے مگر وہ بی بی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جس گھر میں ایک قضیہ ہو جائے تو کیا حالت ہوتی ہے یہاں تو ۷۲ جنازے، زینبؑ ریت گرم پر دیکھ کر آئی ہے اور پھر کئی سو میل کا سفر کر کے آئی تھی۔ یزید سمجھا تھا کہ اب یہ بیبیاں تھک چکی ہیں۔ اب ان میں سکت نہیں ہے۔ لیکن اس کو پتہ نہیں تھا کہ یہ بھی اسی گود کی پلی ہوئی ہے جس گود کا پلا ہوا حسینؑ ہے۔ اس نے بھی اسی ماں کا دودھ پیا ہے جس کا دودھ حسینؑ نے پیا ہے۔ لہٰذا ایک مرتبہ بھرے مجمع میں ثانی زہراؑ کی

آواز گونجی اور کہا کہ یزید خاموش۔ یہ چار دن کی حکومت تجھے مل گئی اور تو سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں تیری عزت ہے۔

یاد رکھ اے یزید! وہ وقت کہ جب تو اور ہم دربارِ الٰہی میں جائیں گے اور اس وقت تو اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور تو کہے گا کہ کاش جو کچھ میں نے کیا وہ نہ کرتا، اور جو کچھ کہا وہ نہ کہا ہوتا۔

زینبؑ نے کہا: تو کہتا ہے کہ وحی نہیں نازل ہوئی تو کہتا ہے کہ کوئی فرشتہ نہیں آیا، وہاں زینبؑ نے ایک چیلنج کیا۔ یزید کے دربار میں جہاں ہزاروں لوگ موجود تھے۔ اے یزید تو جتنی کوشش کر سکتا ہے، کر لے۔ خدا کی قسم! تو ہمارے ذکر کو نہیں مٹا سکتا۔ اور جب ہمارا ذکر نہیں مٹے گا تو پھر وحی کے بھی تذکرے ہوں گے، پھر شریعت کے مسئلے بھی ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ حسینؑ نے دین کو بچایا اور زینبؑ نے حسینؑ کی شہادت کو بچایا۔

عزادارو ــــــ!

اسی مجمع میں یزید کی نگاہ پڑی کہ ایک بچی کھڑی ہوئی ہے کہ جس نے اپنا ایک ہاتھ اپنے ایک چہرے پر رکھا ہوا ہے۔ دوسرا ہاتھ گردن پہ رکھا ہوا ہے۔ یزید نے جب اس بچی کو دیکھا تو کہا کہ یہ بچی کون ہے؟

بتایا کہ حسینؑ کے سینے پہ سونے والی سکینہؑ ہے۔

کہنے لگا: یہ وہی سکینہ کہ جس کے متعلق اس کا باپ کہتا تھا کہ جس گھر میں سکینہؑ نہ ہو وہ گھر مجھے اچھا نہیں لگتا۔

کہنے لگا: اے بچی! کیا بات ہے کہ تو نے ایک ہاتھ گردن پہ رکھا ہوا ہے،

دوسرا ہاتھ چہرے پہ رکھا ہوا ہے؟

کہا: اے یزید! گردن پہ ہاتھ اس لیے رکھا ہوا ہے کہ تیرے سپاہیوں نے رسیاں اتنی کس دی ہیں کہ میری گردن گھٹتی ہے اور چہرے پہ ہاتھ اس لیے رکھا ہے کہ میں فاطمہ زہراؑ کی بیٹی ہوں۔ میری ماؤں اور پھوپھیوں کے بال بڑے ہیں۔ وہ اپنے چہرے پر ڈال سکتی ہیں۔ میرے بال چھوٹے ہیں اور چہرے کو نہیں چھپا سکتے۔ لہٰذا میں نے یہ ہاتھ اپنے چہرے پہ رکھے ہوئے ہیں۔ مولانا کلب حسین صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یزید کہنے لگا کہ سکینہؑ! میں نے سنا ہے کہ تمہارے باپ کو تم سے بڑی محبت تھی۔ کیا میں اس بات کا امتحان لے سکتا ہوں۔

بی بی نے کہا کہ کیوں نہیں۔

یزید نے کہا کہ تمہارے باپ کا سر یہاں میرے طشت میں رکھا ہوا ہے۔ تم وہاں کھڑی رہو اور اپنے باپ کو بلاؤ کہ حسینؑ طشت کو چھوڑ کر تیری گود میں چلا آئے۔ تو میں سمجھوں گا کہ تیرے باپ کو تجھ سے بڑی محبت ہے۔

عزادارو......!

جسے طمانچے مارے گئے ہوں تو باپ کو نہیں پکارا، گلیوں میں پھرایا تو باپ کو نہیں پکارا لیکن جب یزید نے یہ بات کہی تو بچی نے اپنی گود پھیلا دی اور کہا کہ بابا! یزیدیوں کا مجمع ہے اور ہماری محبت کا امتحان ہو رہا ہے۔ آ جاؤ بابا! آ جاؤ بابا! سرِ حسینؑ اُٹھا اور پرواز کرتا ہوا بچی کی گود میں آ گیا۔

●......●......●

مجلس ششم

- ایک وہ کہ جنہیں اصولِ دین کہا جاتا ہے اور ایک وہ کہ جنہیں فروعِ دین کہا جاتا ہے۔
- ایک خدا کو مانو، اور جسے وہ منواتا ہے اس کو مانو۔
- پیار تو تب ہوگا کہ جس نے اس کو بت شکن بنایا ہے اس کو بھی پیار کرو۔
- پہلے دیکھو تو کہ اُونٹ ہے یا اُونٹنی ہے۔
- میرے پاس اس قسم کے لوگ رہتے ہیں جو اُونٹ اور اُونٹنی میں فرق نہیں کر سکتے۔
- معاشرے کی بات وہ کرتے ہیں کہ جو معاشرے کے مفہوم سے واقف نہیں ہیں۔
- اگر کوئی شخص حسینؑ اور یزید میں بھی فرق نہیں کر سکتا تو یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے کہ ہم یہاں اسلام لے آئیں گے۔
- یہ تو صدقہ تھا امام حسینؑ کی شہادت کا کہ مُردہ دلوں میں اس نے جان ڈال دی۔
- اب شیعہ مذہب کیا ہے؟ یہ کسی سے پوچھنا ہے۔
- اس لیے کہ گھر والے گھر کی بات کو بہتر جانتے ہیں۔

ذکرِ مصائب

- شہادتِ جنابِ عباس علمدارؑ

مجلسِ ششم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ارشادِ رب العزت ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (سورہ آل عمران، آیہ ۱۹)

"یقیناً اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے"۔

میں نے پہلے بھی آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ دین کے دو حصے ہیں: ایک وہ کہ جنہیں اصولِ دین کہا جاتا ہے اور ایک وہ کہ جنہیں فروعِ دین کہا جاتا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ دین کو ایک درخت سے تشبیہ دی جاتی ہے کہ جس کے دو حصے ہوتے ہیں: ایک تو اس کی جڑیں جو زمین میں ہوتی ہیں، کسی کو نظر نہیں آتیں لیکن درخت کا سبز و شاداب ہونا اور مضبوط ہونا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اس درخت کی جڑیں مضبوط ہیں تو اسی طریقہ سے اصولِ دین کا تعلق انسان کے عقیدے کے ساتھ ہے، دل کے ساتھ ہے۔ دل کے اندر وہ عقیدہ ہوتا ہے اور اس کا اظہار اور اس کی دلیل فروعِ دین ہوتے ہیں۔ اگر اُن کی کوئی شخص پابندی کرتا ہے، ان کا تابع ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دین کی جڑیں مضبوط ہیں اور اگر

کوئی فروعِ دین کی پابندی نہیں کرتا تو اس کا معنی یہ ہے کہ جڑیں کھوکھلی ہیں اور البتہ اعمال کی صحت اور اعمال کی قبولیت موقوف ہے اصولِ دین کی صحت پر۔

اگر اصولِ دین صحیح ہیں، صحیح طور پر ان کو اپنایا گیا ہے اور دوسرے لفظوں میں گویا ٹھوک بجا کر انسان نے اپنے دین کو اصول کو مانا ہے تو پھر یقیناً اس درخت کی جو ٹہنیاں ہوں گی، جو اس کی شاخیں ہوں گی، جو اس کا پھل ہوگا، وہ بھی صحیح ہوگا اور اگر وہ جڑیں ٹھیک نہیں ہیں۔ ان میں کوئی خرابی ہے تو نہ تو وہ درخت برقرار رہ سکتا ہے اور نہ مطلوبہ ثمر اس سے حاصل ہو سکے گا۔

اب وہ اصولِ دین ہیں کیا؟ ان کو دو لفظوں میں اگر میں آپ کے سامنے بیان کرنا چاہوں تو وہ یہ ہے کہ ایک خدا کو مانو، دوسرا جسے وہ منواتا ہے اس کو مانو۔

یہ خلاصہ ہے اصولِ دین کا۔ اگر کوئی اللہ کو نہیں مانتا اور کہے کہ میں فلاں نبی کو مانتا ہوں، فلاں امام کو مانتا ہوں۔ یہ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک شاعر ہندوستان سے آئے تھے تو وہ مجھے رباعی مکمل طور پر تو یاد نہیں ہے مگر ایک آدھ فقرہ میرے ذہن میں ہے کہ اس نے کہا تھا کہ میں ایک ہندو اور ایک بت شکن سے پیار کرتا ہوں۔ پیار تو تب ہوگا کہ جس نے اس کو بت شکن بنایا ہے، اس سے بھی پیار کرو۔

سب سے پہلے یہ ہے کہ خدا کو مانو اور پھر جس جس کو وہ منوائے، جس حیثیت سے منوائے۔ اگر کسی کو وہ نبیؐ کی حیثیت سے منواتا ہے تو اس کو نبیؐ کی حیثیت سے مانو۔ کسی کو رسول منواتا ہے تو اس کو رسول مانو، کسی کو وہ صاحبِ شریعت منواتا ہے تو اس کو صاحبِ شریعت مانو۔ اور اگر وہ کہے کہ یہ آخری رسول ہے، یہ سب کا سردار ہے، یہ سب کا خاتم ہے، تو اس کو اسی حیثیت سے مانو اور اس

کی جگہ پر جنہیں وہ منوائے، تو انہیں مانو، اپنی طرف سے کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔

اور یاد رکھیے ـــــ!

کہ اس منوانے کے سلسلہ میں اس نے جب اس کی پہلی اینٹ رکھی تھی۔ میں نے پہلے بھی کسی مجلس میں عرض کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں اتنا خوددار ہے یا اتنی اہمیت دیتا ہے اس امر کو، کہ وہ معصوموں کے مشوروں کو بھی قبول نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس معاملے میں کسی کو بھی دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی دخل نہ دے، اور کسی کے دخل کو میں برداشت نہیں کرتا۔

بس جسے وہ منوائے اسے مانو اور اگر نہیں مانو گے تو اسی پہلے دن والے جس نے نہیں مانا تھا جو اس کا حشر ہوا تھا، وہی کسی کو نہ ماننے والے کا حشر ہوگا۔

تو اب سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ اس کو مانا جائے اور بڑی احتیاط سے مانا جائے۔ بڑی دقت اور غور وفکر سے مانا جائے کیونکہ اگر اس بنیاد کے ماننے میں ہی کمزوری رہ گئی تو جنہیں وہ منوانا چاہتا ہے وہ کمزوری اُدھر بھی آئے گی۔ اگر اس کی حیثیت کو صحیح طور پر نہیں سمجھا تو جس کو منوانا چاہتا ہے اس کی بھی حیثیت ذہن میں نہیں آئے گی بلکہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ پھر یہ بھی امتیاز نہیں رہتا کہ کسے ماننا ہے اور کسے نہیں ماننا۔

پُرانے زمانے کی بات ہے کہ اسی انارکلی میں ہمارے ایک عزیز رہتے تھے۔ ان کے ہاں ایک چھوٹی بچی تھی اور جیسے آپ کے ہاں یہ ہوتا ہے کہ آپ بچوں سے پوچھتے ہیں کہ کس کے بیٹے ہو تو وہ کہتے ہیں کہ میں امی کا یا ابا کا، تو اسی لب و لہجہ میں مَیں نے اس بچی سے پوچھا کہ کس کی بیٹی ہو تو کہنے لگی: "دوواں دی"۔

تو بعض اوقات حق و باطل کا امتیاز نہیں رہتا، اگرچہ صحیح اس کو نہیں مانتا۔ ایک واقعہ ہے کہ جناب امیرؑ کا صحابی تھا جس کا نام تھا طرماح ابن عدی۔ یہ انتہائی فصیح و بلیغ انسان تھا اور پکا و سچا موالی تھا سرکار امیرؑ کا۔

اس کو اتفاق ہوا کہ شام بھیجا گیا۔ مولاؑ نے بھیجا۔ تو خیر، آپ تو جانتے ہیں کہ باطل کے پاؤں تو ہوتے نہیں ہیں۔ لہٰذا انہوں نے خوب اہلِ دربار کو زچ کیا اور وہ تنگ آ گئے تو انہوں نے ایک مقدمہ بنایا کہ کہنے لگے کہ یہ جو اُونٹ ہے یہ اُونٹ اس کا نہیں ہے بلکہ اس نے چوری کیا ہے۔ تو وہ مقدمہ عدالت عالیہ میں پیش ہو گیا کہ اس آدمی نے یہ اُونٹ چوری کیا ہے۔

انہوں نے کہا کہ اس کا ثبوت۔ تو پچاس آدمیوں نے گواہی دی کہ یہ اُونٹ فلاں شخص کا ہے۔ خیر یہ خاموشی سے سنتے رہے۔ چنانچہ عدالت عالیہ نے فیصلہ کر دیا کہ یہ اُونٹ اُس آدمی کا ہے اِس کا نہیں ہے۔

جب یہ فیصلہ ہو گیا تو طرماح نے مسکرا کر دیکھا اور کہا کہ پہلے دیکھو تو کہ اُونٹ ہے یا اُونٹنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہرحال فیصلہ ہو گیا ہے۔ اب جب فیصلہ ہو گیا ہے تو یہ واپس جانے لگے تو امیر شام نے علیحدگی میں اُن سے کہا کہ جناب علیؑ سے جا کر کہنا کہ میرے پاس اسی قسم کے لوگ رہتے ہیں جو اُونٹ اور اُونٹنی میں فرق نہیں کر سکتے۔

تو جب وہ لوگ اُونٹ اور اُونٹنی میں فرق نہیں کر سکتے تو پھر علیؑ اور امیر شام کے درمیان کیا فرق کریں گے۔ یہ تو پرانے زمانے کی بات ہے کہ جب لوگ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے تھے لیکن اب اس ترقی کے زمانے میں اور جو لوگ جدید علوم سے آراستہ ہیں تو آپ کو یاد ہوگا کہ چند سال پہلے، ان دنوں میں یہی پڑھ

رہا تھا۔ تو غالباً یہی تاریخ تھی کہ اخبارات میں اعلان ہوا کہ فلاں صاحب کی صاحب زادی کی شادی ہو رہی ہے۔

چنانچہ ایک میلاد النبی کا جلسہ تھا اور مجھے بھی وہاں بلایا گیا تو وہ صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے تقریر کی اور انہیں معاشرے کا بڑا درد تھا۔ معاشرہ ایسا ہونا چاہیے۔

تو بہرحال ــــــ!

اس کے بعد میری تقریر تھی تو میں نے کہا کہ رونا تو اس بات کا ہے کہ معاشرے کی بات وہ کرتے ہیں کہ جو معاشرے کے مفہوم سے واقف نہیں ہیں، اس لیے کہ معاشرے کے تقاضوں کو جو آدمی نہیں سمجھ سکتا، اس کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ معاشرے پر گفتگو کرے۔

تو میں نے عرض کیا کہ مثلاً اگر کسی کا باپ مر جائے اور اس کی میت پڑی ہوئی ہو، اب اگر اس وقت وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی رچائے تو کوئی مذہب بھی اس کو حرام نہیں کہتا، اور نہ ہی کسی مذہب کو یہ کہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس لیے کہ یہ تو معاشرے کی بات ہے۔ باوجودیکہ اسلام اور کوئی مذہب دنیا کا اس کو ناجائز قرار نہیں دے سکتا۔ لیکن اگر وہ اس وقت اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی رچائے تو معاشرے کا ہر شخص اس کو معاشرے کا بدترین انسان سمجھے گا۔

حالانکہ ہوسکتا ہے کہ باپ اس کا مسلمان ہی نہ ہو۔ کافر ہو، مذہب کا بھی فرق ہو، کیوں کہ ماں باپ کے ساتھ تو ایک مادی رشتہ ہے۔ ٹھیک ہے ان کے کچھ احکام ہیں۔ خالقِ کائنات کی طرف سے ماں باپ ہونے کی حیثیت سے لیکن وہ بہرحال ایک مادی رشتہ ہے اور جن کے ساتھ انسان کا روحانی رشتہ ہو، اگر ان کی

مصیبت کے دنوں میں یہ حرکت کرتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ دنیا کا کوئی عقل مند آدمی اس کو اچھا انسان نہیں سمجھے گا۔ معاشرہ اس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے گا۔ تو بہرحال یہ تو کئی سال پہلے کی بات ہے۔ تو آج بھی ایک جنگ کے اخبار میں ایک موضوع کی طرف میری توجہ دلائی گئی۔

اچھا ــــــ!

یہ صاحب ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے، کیا معلوم کہ دکان نہیں یا نوکری نہیں ملی۔ تو وہ مفسر قرآن ہو گئے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ اس معاشرے میں ہم اسلام لے آئیں گے۔ تو ساری بات وہی ہے کہ جس مقام کا کوئی اہل نہ ہو، جب اسے وہ مقام دیا جائے تو پھر جتنی خرابیاں اس پر مترتب رکھی جا سکتی ہیں مترتب ہو کر رہیں گی۔ جب اینٹ ہی غلط رکھی گئی تو پھر وہاں سے توقع کرنی غلط ہوتی ہے۔

ایک تو اس نے خطبۂ جمعہ میں یہ کہا ہے کہ یہ حضرات جو خلفاء صالحین تھے یہ تو آپس میں سب شیر و شکر تھے اور مل کر دین کی خدمت کرتے تھے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کی جنگ میں اس لشکر کا سپاہ سالار یزید تھا اور اس کی ماتحتی میں حسنینؑ بھی گئے تھے۔ اب یہ ان بزرگوار کو کون سمجھائے کہ ایسی باتیں جو لکھی گئی تاریخوں میں ویسی تاریخیں ہمارے زمانے میں بھی لکھی جاتی ہیں۔ تو اب یہ تو پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ صحیح اور غلط کا امتیاز کر سکے۔

تو اب اس بزرگوار کو کوئی کہے کہ حضور جس وقت یزید مرا ہے تو ۳۵ سے ۳۸ سال اس کی عمر تھی اور قسطنطنیہ کی جنگ جو ہے وہ حضرت عثمان کے زمانے میں ہوئی ہے۔ اس کے بعد پانچ سال جناب امیرؑ کی حکومت رہی۔ دس سال امام حسنؑ کا زمانہ رہا۔ دس سال امام حسنؑ کے بعد امام حسینؑ کا زمانہ رہا۔ اور سن ۶۴ ہجری

میں جا کر یزید مرا ہے۔ یہ ہوئے تو انتیس سال بنے۔

اور اب قسطنطنیہ کی جنگ حضرت عثمان کے آخری زمانے میں نہیں ہوئی بلکہ ان کے درمیانی زمانہ میں ہوئی۔ کم از کم تین چار سال ان کی وفات سے پہلے۔ تو آپ کے ممدوح ہیرو اس وقت شاید پیدا ہی نہیں ہوئے تھے یا گھٹنوں کے بل چلتے تھے تو یہ آج کل ریسرچ ہے، تحقیق ہے اور یہ خطبات جمعہ میں اب اگر کوئی شخص حسینؑ اور یزید میں بھی فرق نہیں کرسکتا تو وہ یہ دعویٰ کرے کہ ہم یہاں اسلام لے آئیں گے۔

میں نے بہت پہلے عرض کیا تھا کہ یزید کی شخصیت مسلمانوں میں کبھی بھی متنازع نہیں تھی۔ اس کا کردار اتنا بھیانک ہے کہ کسی بھی مہذب مجلس میں وہ ذکر کرنے کے قابل نہیں ہے اور میں نے بھی تھوڑی سی خدمت اس سلسلے میں جو کی ہے کہ "انتخاب طبری" میں طبری کے متعلق مولانا مودودی صاحب اپنی کتاب خلافت و ملوکیت میں لکھ گئے تھے کہ طبری کتنا بڑا مؤرخ تھا، کتنا بڑا اہل سنت کے نزدیک موثق ترین شخص تھا۔ طبری نے جس احتیاط کے ساتھ یزید کا کردار پیش کیا اتنا کسی نے نہیں کیا کہ یزید کے ساڑھے تین سالہ دور میں جہاں یہ کہ اس کا انفرادی کردار جو کچھ تھا، کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ وہ بندروں کو علماء کا لباس پہنا کر اسلام کی توہین کرتا تھا۔ اور اس کی مکاریاں اور بدکرداریاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ وفد جو مدینے سے گیا تھا اس کے افعال و کردار دیکھنے کے لیے، تو انہوں نے کہا کہ ہم جلدی اس لیے پلٹ آئے ہیں کہ شاید اس پر عذاب نازل نہ ہو جائے اور ہم بھی مبتلا نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اہل مدینہ نے جو بے حس ہو چکے تھے۔ یہ تو صدقہ تھا امام حسینؑ کی شہادت کا، کہ مُردہ دلوں میں

اس نے جان ڈال دی۔

لہٰذا اہلِ مدینہ نے کلیتاً یزید کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جتنے بنی اُمیہ کے لوگ وہاں موجود تھے اور حکومت کے کارندے تھے ان سب کو وہاں سے نکال دیا یا قید کر دیا۔ پھر اس کے بعد یزید نے شام سے ایک فوج بھیجی، وہی فوج جس کا ذکر پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جو اُونٹ اور اُونٹنی میں فرق نہیں کر سکتے تھے اور ان سے کہا کہ اگر وہ اطاعت قبول نہ کریں تو ان سے جنگ کرنا اور تین دن تک تمہیں اجازت ہے کہ مدینہ کو خوب لوٹو۔ اس مدینہ کو کہ جس کے بارے میں مسلمانوں کی صحیح ترین کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ پیغمبرِ اسلام پہلے سے بتا گئے تھے کہ ملعون ہے وہ شخص جو اہلِ مدینہ کو ڈرائے۔

تو جب فوج آئی تو اس فوج نے آ کر لڑائی کی۔ لہٰذا مسلمان جن میں صحابہ کرام بھی تھے اور ایک دو، دس نہیں تھے سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ چنانچہ جو وہاں پر شہید ہوئے، ان میں ساڑھے تین سو صحابی تھے اور ۱۰ ہزار کے قریب مرد، عورتیں اور بچے شہید ہوئے اس جنگ میں، کہ جس کو واقعہ حرہ کہا جاتا ہے۔

صحابہ اور اہلِ مدینہ کا خون بہہ بہہ کر روضۂ رسولؐ پر پہنچا اور مسجد نبوی میں گھوڑے باندھے اور کئی دن تک مسجد نبوی میں نماز وغیرہ کا سلسلہ بند رہا اور جنگلی جانور وہاں آ کر مسجد نبویؐ کی بے حرمتی کرتے تھے اور انہوں نے جو جو کردار پیش کیے جیسے کہ میں نے کہا کہ وہ کردار مہذب محفل میں بیان کرنے کے قابل نہیں ہے کہ اس فوج نے کیا کچھ کیا۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ اس واقعے کے بعد ایک ہزار بچہ پیدا ہوا۔

یہ وہ سپاہی ایک صحابیِ رسولؐ کے گھر گھس گئے اور ابھی تازہ ان کا بچہ

پیدا ہوا تھا جو چند دنوں کا تھا تو وہ بچہ کی ماں سے کہنے لگے کہ اگر اس بچے کو بچانا چاہتی ہو تو کچھ ہمیں دو۔

اس نے کہا کہ اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو یقیناً میں اپنے بچے پر قربان کر دیتی۔

یزید تو ایسا شخص تھا کہ جو کہتا تھا کہ بنی ہاشم نے تو ایک کھیل کھیلا تھا، نہ کوئی وحی آئی تھی اور نہ کوئی فرشتہ آیا تھا۔ جو یہ کہے کہ شراب اگر دین احمد میں حرام ہے تو میں اسے دین عیسوی کی بنا پر پی لوں گا اور جو اپنی محبوبہ سے کہے کہ میرے بعد کسی اور سے تعلقات قائم کر لینا۔ اس لیے کہ قیامت تو ایک ڈھونگ ہے۔

لیکن اخبارات میں اس کو امیر المومنین اور سیدنا کے القاب دیئے گئے ہیں تو کیا اس ملک میں اس قسم کے اسلام کا پرچار کیا جا رہا ہے؟

یہ ملک جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ جو یزید اور اس کا خاندان اس دین کی جو دشمنی کرتے تھے ان کی اب اس ملک میں مدح و ثنا ہوتی ہے۔

اور میں نے پہلے بھی کئی مجلسوں میں عرض کیا ہے کہ اہلِ سنت یقیناً اہلِ بیتؑ سے محبت رکھتے ہیں اور دشمنانِ اہلِ بیتؑ سے نفرت کرتے ہیں اور یزید کو تو یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مسلمان اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کرے اور اگر یزید بھی اچھا ہے تو پھر دنیا میں تو اچھا ہے ہی نہیں۔

تو ایک ریسرچ تو حضرت ڈاکٹر صاحب کی یہ تھی اب دوسری ریسرچ انہوں نے پیش کی۔ وہ یہ کہ عبداللہ بن سباء نامی ایک یہودی تھا، وہ ظاہراً مسلمان ہو گیا اور حضرت عثمان کے زمانے میں اس نے اتنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا کہ صحابہ

کرام اور سب مسلمانوں کو گمراہ کر کے حکومت اسلامیہ کے خلاف سازش کی۔

اب اس سلسلہ میں مجھے ایک پرانی مثال، مشہور ہے کہ کوئی بیس آدمی جا رہے تھے تو جب گھر واپس آئے تو کہنے لگے کہ ہم اکیلے بیس آدمی تھے کہ دو ڈاکوؤں نے آ کر ہمیں لوٹ لیا۔ تو جناب ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ ایک یہودی تھا اور اس نے ایسا کام کیا کہ سب گمراہ ہو گئے۔ گویا حق کے راستے سے ہٹ گئے اور وہ سبب بنا۔ یعنی یہ کتنی توہین ہے اصحاب پیغمبرؐ کی اور مسلمانوں کی کہ وہ یہ بات سمجھ ہی نہیں سکے کہ ایک یہودی ہمیں گمراہ کر رہا ہے تو اتنے بھولے بھالے تھے کہ انہیں گویا اسلام کا پتا نہیں تھا؟ اسلام سے وہ واقف نہیں تھے؟ جدھر چاہا اس کو لگا دیا۔

حالانکہ اس پر علماء مصر نے کتابیں لکھی ہیں کہ عبداللہ ابن سباء نامی کوئی بندہ ہی پیدا نہیں ہوا دنیا میں۔ یہ ہم نے نہیں بلکہ ہمارے دوسرے علماء نے یعنی علماء مصر نے تحقیق کی ہے۔ پھر یہ کتنا بڑا الزام ہے مسلمانوں پر کہ وہ اسلام کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ ایک آدمی نے آ کر ان کو گمراہ کر دیا۔

حالانکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ عموماً جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں یہ درج ہے کہ شیعہ جو ہیں یہ عبداللہ ابن سباء کی پیداوار ہے۔ یہ تاثر دیا جاتا ہے اور یہ تاثر حتیٰ کہ سعودی عرب کی گیارہویں کلاس میں یہ کتاب شامل ہے۔

اب شیعہ مذہب کیا ہے؟ یہ کس سے پوچھنا ہے؟ ہمارے کیا نظریات ہیں؟ ہمارے کیا عقائد ہیں؟ ہم خدا کو وحدہٗ لاشریک مانتے ہیں اور اس کو تمام عیوب سے منزہ اور مبرہ سمجھتے ہیں۔ خدا کو ہم عادل مانتے ہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کو برحق سمجھتے ہیں اور ان کو معصوم و منتخب من اللہ سمجھتے ہیں۔ قیامت کے

بمع اس کے تفصیلات کے ہم عقیدہ رکھتے ہیں۔

فرق ان میں اور ہم میں یہی ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ جیسے سرکار رسالتؐ دین کے مبلغ و محافظ خدا معین کرتا رہا ہے۔ حضوؐر کے بعد بھی خدا کے معین شدہ ہیں۔ جیسے پہلے معصومؑ تھے اس طریقہ سے یہ بھی معصوم ہیں۔ ہم اپنے اور خدا کے درمیان اس کو نمائندہ مانیں گے جس کو وہ معین کرے گا۔ ہم دین کے اصول اور فروع خاندانِ رسالتؐ سے لیں گے۔ کیوں؟

بقول مولانا شبلی نعمانی کے وہ ایک جگہ پر لکھتے ہیں کہ ابن تیمیہ کی یہ خلاف حقیقت بات ہے کہ وہ کہتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد کیسے ہوسکتے ہیں۔ اس کے بعد شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ لاکھ مجتہد ہوں انہیں حضرت امام جعفر وصادق علیہ السلام کے ساتھ کیا نسبت اس لیے کہ گھر والے گھر کی بات کو بہتر جانتے ہیں۔ (نعرۂ حیدری)

تو ہم وہی بات لیں گے جس کی خاندانِ رسالتؐ یا ان کی طرف سے جو پہنچے گی اور دنیاداروں کو اصلاً یہی بات پسند نہیں آئی۔ لہٰذا اس خاندان کے ساتھ دشمنی اسی بنا پر تھی کہ ہم کہتے تھے کہ ہم دینِ رسول کو ساری دنیا سے بہتر سمجھتے ہیں اس لیے کہ ہم نے دین خود رسولؐ سے براہِ راست سیکھا ہے۔ ان کا ماخذ اور واسطے نہیں تھے بلکہ یہ خود واسطے تھے دین رسالتؐ کے۔

ذکرِ مصائب: شہادت جنابِ عباس علمدارؑ

دوستو! کربلا میں، یہ کربلا کی جنگ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ایک سلسلہ وہ ہے کہ جو یزید تک پہنچتا ہے۔ ایک سلسلہ وہ ہے کہ جو حسینؑ تک پہنچتا

ہے۔ ایک اور بات بھی جو ایک کتاب پہلے لکھی گئی تو ڈاکٹر اقبال کا ایک مشہور شعر ہے کہ قربانی کے سلسلے میں مثلاً ابتداء اس کی اسماعیلؑ۔

تو اب لوگ کہتے ہیں کہ یہ شعر اس نے ٹھیک نہیں کہا بلکہ یوں کہنا چاہیے تھا کہ ابتداء اس کی ہابیل......

اور آخری جملہ میں کہہ نہیں سکتا۔

تو بہر حال ــــــ!

صرف یزید کا بدترین واقعہ کربلا ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی واقعات ہیں جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ تو اب حسینؑ کربلا میں صبح سے لے کر عصر تک مختلف قربانیاں دیتے رہے۔ اب بقول بعض علماء کے کہ یہ جو ترتیب تھی کہ پہلے کون شہید ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ نے خود یہ ترتیب رکھی تھی۔ یہ امام حسینؑ کی ترتیب تھی کہ اصحاب جائیں پھر خاندانِ رسالتؐ کے دُور دُور کے جو رشتہ دار ہیں وہ جائیں پھر حسینؑ کے قریب ترین جو عزیز ہیں وہ جائیں کیونکہ بقول ان کے کہ دسویں کے دن اتنا مرنا مشکل نہیں تھا جتنا جینا مشکل تھا۔

لہٰذا جن میں تحمل کی، صبر کی قوت زیادہ تھی اس کو بعد میں رکھا گیا، جس میں کم تھی اس کو پہلے رکھا گیا۔ زیادہ تر کربلا کے مؤرخین کے بقول کربلا کے آخری شہید حسینؑ اور علی اصغرؑ سے پہلے، کون ہیں؟ عباسؑ ہیں؟ جنابِ عباسؑ امام مظلومؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: مولاؑ! اب تو مجھے موت کی اجازت دے دیں۔

فرمایا: تم تو میری فوج کے سپہ سالار ہو، تو جس فوج کا سپاہ سالار نہ رہے تو وہ فوج ختم ہو جاتی ہے۔

تو عرض کیا کہ مولا وہ فوج رہی کہاں ہے جس کا میں سپہ سالار ہوں۔

کہا کہ مجھے اجازت دیجیے کہ اب بچوں کی العطش کی آوازیں مجھے بیٹھنے نہیں دے رہیں۔

فرمایا: اچھا بھائی جاؤ اور بچوں کے لیے پانی لے آؤ۔

عزادارو......!

حسینؑ نے اپنے بھائی کو پانی لینے کے لیے بھیجا۔ اب جو ٹیکنیک میرے ذہن میں ہے وہ یہ ہے کہ پشت پر دریا تھا، دریا کے آگے یزید کی فوج تھی اور آگے میدان تھا اور میدان سے آگے خیامِ امام حسینؑ تھے۔ لہٰذا کسی نے اگر دریائے فرات پر جانا ہے تو اس کو میدان بھی عبور کرنا پڑے گا۔ پوری یزیدی فوج کو بھی ہٹانا پڑے گا۔ پھر جا کر وہ دریا کو پہنچے گا۔

یہی وجہ ہے کہ فوجِ حسینیؑ میں بڑے بڑے شجاع اور بہادر تھے لیکن دو افراد دریا کے کنارے تک پہنچ سکے، خود حسینؑ گئے ہیں یا عباسؑ گئے ہیں۔

یہ وہ کارنامہ ہے کہ جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ اس لیے کہ فوجِ یزید کی کم از کم تعداد جو بیان کی گئی ہے وہ تیس ہزار ہے۔ لاکھوں تک بھی بتائی گئی ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ۳۰ ہزار ہے تب بھی ۳۰ ہزار کی فوج کو پار کر کے دریا پر پہنچ جانا اور قبضہ کر لینا۔ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ آج تک کسی سے نہیں ہو سکا۔

اور پھر صرف یہ نہیں ہے کہ صرف ان کو ہٹا دیا بلکہ اتنا دور ہٹا دیا کہ گھوڑا دریا میں ڈالا، اور پانی سے مشک بھر کی اور جب بھر کر چکے تو پھر چلو پانی کا ہاتھوں میں بھی لیا اور اس فوج کو دکھایا۔

اب مؤرخین عموماً یہ لکھتے ہیں کہ عباسؑ پانی پینا چاہتے تھے لیکن حسینؑ کی

اور چھوٹے بچوں کی پیاس یاد آگئی تو انہوں نے پانی نہیں پیا۔

یہ ان کی خود ذاتی قیاس آرائی ہے، اس لیے کہ کوئی مورخ اس وقت عباسؑ کے پاس تو نہیں تھا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ پہلے جب عباسؑ گئے تھے میدان میں تو ان سے کہا تھا کہ اے مسلمانو! کیا تمہارے مذہب میں یہ جائز ہے کہ نجس جانور تو فرات کا پانی پی لیں لیکن اولادِ رسولؑ اس سے محروم رہے۔ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ ہم یہ پانی نہیں دیں گے۔

تو گویا اب ہاتھوں پر لے کر عباسؑ انہیں کہہ رہے تھے کہ بتاؤ اب اس فرات پر کس کا قبضہ ہے۔ میں چاہوں تو پی سکتا ہوں لیکن پیؤں گا نہیں اس لیے کہ ابھی تو سکینہؑ پیاسی ہے، حسینؑ پیاسے ہیں، زینبؑ و اُمِ کلثومؑ پیاسی ہے۔ ابھی تک تو اصغرؑ پیاسا ہے۔

اور عباسؑ پانی کس طرح پی سکتے تھے۔ پانی پھینک دیا، مشک لے کر واپس پلٹے۔ جب پلٹے تو اب پوری فوج سمٹ کر آگئی اور ساری فوج کی کوشش یہ ہے کہ پانی خیمے میں نہ جائے اور تنہا عباسؑ یہ عزم لیے ہوئے ہیں کہ کسی طریقے سے یہ پانی بچوں تک پہنچ جائے۔

عزادارو۔۔۔۔!

ان ملاعین نے محسوس کیا کہ جب تک عباسؑ کے بازوؤں سلامت ہیں۔ ہم ان سے مشک نہیں چھین سکتے۔ لہٰذا ایک ظالم نے ایک درخت کی اوٹ سے ایسا وار کیا کہ جنابِ عباسؑ کا دایاں بازو قلم ہو گیا تو آپ نے مشک بائیں بازو میں لے لی۔ کچھ دیر کے بعد ایک ملعون نے بائیں بازو پر حملہ کیا اور وہ قلم ہو گیا۔

اب جلدی سے جنابِ عباسؑ نے مشک کے تسمیں منہ میں لے لیے۔ اب

ذرا تصور کریں کہ میدانِ جنگ میں ایک شخص کے پاس مشک ہے اور اس کے دونوں بازو قلم ہوگئے ہیں اور اس نے اس کے تسمیں اپنے منہ میں لے رکھے ہیں۔ اگر تیر آئیں تو وہ تیروں سے مشک کو کیسے بچاتا۔

مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ جدھر سے تیر آتا تھا، عباس اُدھر جھک جاتے تھے کہ تیر میرے جسم پر لگیں لیکن مشک بچ جائے۔ اسی کشمکش میں آخر ایک ایسا تیر آیا کہ جو عباسؑ کی امیدوں پہ پانی پھیر گیا۔ اِدھر مشک میں تیر لگا اور اُدھر ایک ظالم نے گرز کا ایسا وار کیا کہ جنابِ عباسؑ اب گھوڑے کی زین پر سنبھل نہ سکے۔

تصور کیجیے کہ جب گھڑسوار جب گھوڑے کی زین سے گرتا ہے تو زمین پر ہاتھوں کے سہارے آتا ہے مگر عباسؑ کے تو ہاتھ بھی قلم ہو چکے ہیں، زمین پر کس طریقے سے آئے ہوں گے۔

اُدھر عباسؑ گرے اور اِدھر حسینؑ سے کرسی چھوٹی، اور حسینؑ نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر یہی کہا: اے عباسؑ! اب حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی اور حسینؑ کے سارے سہارے ختم ہوگئے۔

زہراؑ کا لال خیام سے چلا، عباسؑ کی لاش پر پہنچا۔ عباسؑ کا سر اپنے زانو پر رکھا تو جنابِ عباسؑ نے عرض کیا:

مولاؑ! میں سنتا ہوں کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو سب سے پہلے آپ کے چہرے کی زیارت کی تھی۔ دل چاہتا ہے کہ آخری مرتبہ بھی آپ کے چہرے کی زیارت کر کے جاؤں۔

تو فرمایا: بھائی پھر دیکھتے کیوں نہیں۔

عرض کیا: مولاؑ! کیسے دیکھوں ایک آنکھ میں تیر لگا ہوا ہے اور ایک آنکھ

میں خون بھرا ہوا ہے۔ مظلوم امامؑ نے جس آنکھ میں خون بھرا ہوا تھا اس آنکھ کو رومال سے صاف کیا۔ عباسؑ نے امام مظلومؑ کے چہرے کی زیارت کی۔ دونوں بھائی باتیں کرتے رہے۔

حسینؑ نے محسوس کیا کہ عباسؑ کی سانس اُکھڑنے لگی تو لہٰذا دستور کے مطابق چاہا کہ عباسؑ کو اُٹھا کر لے جائیں تو جب جناب عباسؑ نے دیکھا کہ حسینؑ مجھے اُٹھانا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے:

مولاؑ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔

فرمایا: عباسؑ! میرا تو دستور ہے کہ تمام شہداء کی لاشیں اٹھا کر لے گیا ہوں۔

عباسؑ کہتے ہیں کہ مولاؑ میری لاش یہیں رہنے دیجیے۔

فرمایا: کیوں بھائی؟

کہا: مولاؑ! مجھے سکینہؑ سے شرم آتی ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ بی بی تمھیں پانی پلاؤں گا۔ ہائے افسوس کہ عباسؑ وعدہ پورا نہ کرسکے۔

عزادارو____!

عباسؑ کی روح نے پرواز کیا۔ حسینؑ نے علم اُٹھایا۔ تصور کیجیے کہ بچوں کو پتہ ہے۔ وہ بچے جو تین دن کے بلکہ چار دن کے بھوکے اور پیاسے ہیں، انھیں پتہ ہے کہ پانی لینے کے لیے گئے ہیں لہٰذا خیمے کے دروازے پر وہ بچے جمع ہوں گے۔ بعید نہیں ہے کہ جناب سکینہؑ انھیں تسلیاں دے رہی ہو۔

بچو! گھبراؤ نہیں، ابھی میرے چچا پانی لے کر آئیں گے، سیراب کریں گے۔ بچوں کی نگاہ گویا علم کو تلاش کر رہی تھی۔ اچانک بچوں کی نگاہ پڑی کہ علم آ رہا

ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ اس علم کے ساتھ پانی آ رہا ہوگا۔ عباسؑ پانی لا رہے ہوں گے۔ علم جیسے جیسے قریب آ رہا تھا۔ بچوں کے دل اور بڑھ رہے تھے۔

عزادارو____!

اچانک بچوں نے دیکھا علم تو آیا لیکن علم دار نہ آیا۔

●......●......●

مجلس ہفتم

- اس منصب کا جو علمی معیار ہے اس کی سند اس کی حکومت کی طرف سے ہونی چاہیے۔
- جتنا اس کا منصب بڑھتا جائے گا اتنا تعلیمی معیار بڑھتا جائے گا۔
- پہلے دن اس دنیا میں خالقِ کائنات نے ایک درس گاہ کھولی تھی۔
- یہ علم نہیں تھا کہ کون سا نام کس کا ہے؟ اب ان کے بس میں نہیں تھا کہ اس کی تحقیق کریں۔
- پہلے دن فیصلہ کیا گیا کہ ہمارے نمائندے وہ ہوں گے جو پڑھ کے آئیں گے۔
- کوئی خشک و تر ایسی چیز نہیں ہے جو اس کتاب میں موجود نہ ہو۔
- ابھی بچہ تھا کہ وہ تمام احکامِ شریعت کے فیصلے دے سکتا تھا۔
- جو شخص امام ہوتا ہے وہ کمالات کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے وہ یہاں آ کر سیکھنے کا محتاج نہیں ہوتا۔
- ہم کہتے ہیں کہ خدا کا نمائندہ وہ ہو سکتا ہے جو معصوم ہو۔

ذکرِ مصائب: شہادت حضرت عباس علمدارؑ

- میں اس حسینؑ پر گریہ کرتی ہوں جس کی ماں اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔
- کربلا کے میدان میں حسینؑ نے نظام ذرا بدل دیا۔
- عرض کیا کہ مولاؑ وہ فوج ہے کہاں جس کا میں علمدار ہوں؟

مجلسِ ہفتم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ارشادِ رب العزت ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (سورہ آلِ عمران، آیہ ۱۹)

"جو یقیناً اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے"۔

دوستو اور بزرگو!!

ہر حکومت جو اپنے نمائندے مقرر کرتی ہے عموماً جو اہم چیزوں کی طرف توجہ ہوتی ہے اور جس منصب پر وہ بیٹھ رہا ہے اس کے لیے جو علمی معیار ہے، اس منصب کا جو علمی معیار ہے، اس کی سند اس کی حکومت کی طرف سے ہونی چاہیے۔ یا کوئی ایسی حکومت کہ جو اس سے علمی لحاظ سے زیادہ فائق ہو، اس کی سند ہونی چاہیے۔ معمولی سے معمولی کلرک کے لیے یہ ہے کہ میٹرک ہونا چاہیے۔

جتنا اس کا منصب بڑھتا جائے گا اتنا تعلیمی معیار بڑھتا جائے گا۔ جتنا بلند ترین مرتبہ اس کو حاصل ہوتا ہے، اصولی طور پر اسی لحاظ سے اس کے پاس سند ہونی چاہیے۔ ایک تو یہ اور دوسرا یہ کہ اس کے پاس ایسی دستاویز ہونی چاہیے کہ اس نے گذشتہ زمانے میں اس حکومت کے کسی قانون کی جان بوجھ کر یا بھول چوک سے

کوئی خلاف ورزی نہ کی ہو۔ یہ اور بات ہے کہ چور دروازے سے کوئی آدمی اندر داخل ہوجائے، غلط طور پر پاس ہوجائے۔ غلط قسم کی سند لے لے لیکن اصول یہی ہے کہ دو باتیں اس میں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ جس منصب پر اس کو فائز کیا جا رہا ہے اس کی علمی طور پر جتنی استعداد ضروری سمجھتی ہے وہ حکومت، اس کی سند اس حکومت کی طرف سے اس کے پاس ہونی چاہیے اور دوسرا یہ کہ اس نے اس حکومت کے کسی قانون کی ایک مرتبہ بھی خلاف ورزی نہ کی ہو۔

اور اگر دورانِ ملازمت بھی یہ ثابت ہوجائے کہ اس نے اس حکومت کے کسی قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ چیختا چلاتا رہے کہ میں نے جان بوجھ کر نہیں کی، تب بھی کوئی تسلیم نہیں کرتا۔

تو جس خدا نے ان دنیاداروں کو یہ عقل دی ہے کہ جس منصب پر آپ فائز کسی کو کرنا چاہتے ہیں، ایک تو اس کے پاس سند ہونی چاہیے علمی اور دوسری سند ہونی چاہیے کردار کے لحاظ سے۔

وہ خدا جب اپنے نمائندے مقرر کرتا ہے تو اس میں بھی ضروری ہے کہ علمی طور پر بھی اس کے پاس اس کی طرف سے سند ہونی چاہیے اور عملی طور پر سند ہونی چاہیے۔ اب وہ سند کیسی ہوتی ہے؟ ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ وہ سند کے ثبوت کے لیے اس کے پاس ایک دلیل ہونی چاہیے کہ جس سے یہ یقین پیدا ہوجائے کہ یہ اس کا نمائندہ ہے۔ چنانچہ پہلے دن اس دنیا میں خالقِ کائنات نے ایک درس گاہ کھولی تھی، چھوٹی سی درس گاہ۔ اور ظاہر ہے کہ ہر درس گاہ کی ابتدا وہ ہوتی ہے۔ پہلے زمانے میں تو پہلی جماعت سے ہوئی تھی لیکن اب تو پہلی جماعت سے بھی پہلے ہوتی ہے۔ تو وہاں بھی ابھی معاملہ

پہلی جماعت تک نہیں پہنچا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ پہلی جماعت سے پہلے کیا ہوتا ہے؟ جسے نرسری سکول کہتے ہیں۔

نہ اس میں کتاب ہوتی ہے اور نہ اس میں تختی اور قلم دوات ہوتی ہے۔ صرف بچوں کو نام پڑھائے جاتے ہیں تو خالقِ کائنات نے بھی گویا اس زمین میں بھی جب اصلاً تعلیم تھی ہی نہیں، بالکل ابتداء ہو رہی تھی تو گویا ایک نرسری سکول کھولا۔ جب وہ نرسری سکول کھولا تو اعلان کیا کہ ہم اس کے لیے ایک استاد مقرر کریں گے تو استاد ایک بہت بڑا منصب ہے۔

چنانچہ ملائکہ جو خواہشاتِ نفسانیہ سے منزہ اور مبرہ تھے۔ انہوں نے بھی پروردگارِ عالم کی بارگاہ میں۔ گویا درخواست دے دی کہ ہم جو آخر ہزار ہا سال سے تیری بزم میں رہتے ہیں۔ لہٰذا ہم میں سے بنا دے، کیوں؟

کیا استحقاق ہے تمہارے پاس؟ انہوں نے کہا کہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ نہیں یہ تعلیم کی بات ہے۔ یہاں تسبیح و تقدیس کی بات نہیں ہے۔ یہاں عبادت کی بات نہیں ہے۔ یہاں عابد نہیں چاہیے یہاں تو عالم چاہیے۔

لہٰذا پہلے دن فیصلہ ہو گیا۔ گویا قدرت نے فیصلہ کر دیا اور اگر تمہیں اس کے علم میں شک ہے کہ وہ درس پڑھا سکتا ہے، تعلیم دے سکتا ہے، یا نہیں دے سکتا۔ تو تمہارا اور اس کا ہم مقابلہ کرا دیتے ہیں۔ جب مقابلہ ہوا، آدمؑ جو ابھی پیدا ہوئے تھے، وہ کامیاب ہو گئے اور فرشتے کروڑ ھا سال سے بزمِ قدرت میں رہتے تھے وہ آدمؑ کے مقابلے میں فیل ہو گئے۔ یہ قرآنی فیصلہ ہے اور عموماً غلط فہمی سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان بیچاروں کو بتایا نہیں گیا تھا اور اس کو پرچہ آؤٹ کر دیا تھا اور نتیجہ واضح

تھا کہ فرشتے فیل ہو گئے اور آدمؑ کامیاب ہو گئے۔ میرے خیال میں یہ کام تو بے علم ممتحن ہی کرے گا۔ چہ جائیکہ خالق کائنات۔

بات اتنی تھی کہ ملائکہ یا جتنی مخلوق ہے ان میں ارتقاء کی استعداد نہیں ہے، ترقی نہیں ہے کہ معلومات سے وہ مجہولات کو وہ حاصل کرسکیں جتنی جاندار چیزیں ہیں ان کا علم بس محدود ہے اور یہی معاملہ فرشتوں کا بھی ہے کہ جتنا علم دیا گیا بس اتنا جانتے ہیں۔ واحد یہ انسان ہے کہ جس میں اگر علم ہو جائے تو وہ خود بخود ترقی کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جو قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ کچھ ہستیاں دکھائی گئیں۔ اب اس پر مفسرین بھی غور نہیں کرتے۔ مثلاً میں اب اس آیت کو پڑھتا ہوں آپ اس پر توجہ کریں۔ ارشادِ قدرت ہوا:

اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (سورۂ بقرہ، آیت ۳۰)

"اسماء اور ہیں اور ھولاء اور ہیں"۔

ملائکہ ناموں کو بھی جانتے تھے الگ سے، نام سامنے تھے جن کے نام تھے وہ بھی معلوم تھا لیکن یہ علم نہیں تھا کہ کون سا نام کس کا ہے۔ اب ان کے بس میں نہیں تھا کہ اس کی تحقیق کریں۔ لیکن انسان میں یہ استعداد رکھی گئی ہے کہ اس نے نام کو دیکھا اور نام والے کو دیکھا اور کہا کہ یہ نام اس کا ہے اور پھر ابھی پیدا ہوئے تھے آدمؑ۔ کوئی درمیان میں زیادہ بمشکل آدمؑ کی پیدائش میں اور جنت میں داخل ہونے میں تو درمیان میں جو وقت تھا تو روایات بتاتی ہیں کہ سات گھنٹے کا وقت تھا۔ اب ظاہر ہے کہ انہی سات گھنٹے کے اندر امتحان بھی ہوا تھا اور نتیجہ بھی ہوا تھا۔

تو اتنے مختصر سے وقت میں تو آدمؑ تعلیم حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ تو گویا

پہلے دن فیصلہ کیا گیا کہ ہمارے نمائندے وہ ہوں گے جو پڑھ کے آئیں گے۔ یہاں آ کر نہیں پڑھیں گے۔ ان کا علم وہبی ہوگا کسبی نہیں ہوگا۔

تو یہ ابتداء ہو رہی تھی نرسری سکول کی۔ گویا یہ نرسری سکول بڑھتے بڑھتے پرائمری سکول بنا۔ تو پرائمری سکول میں کیا ہوتا ہے؟ کچھ قاعدے ہوتے ہیں، چھوٹی چھوٹی کتابیں ہوتی ہیں۔ ان کو قرآن کی اصطلاح میں صحیفہ کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ چلتا ہے، پھر ایک منزل آئی کہ کتابیں آئیں۔ چنانچہ توراۃ کتاب آئی۔ پھر اس کے ساتھ زبور، پھر آخر میں انجیل۔ اب یہ کتابوں کا سلسلہ جو شروع ہوا تو گویا وہ نرسری سکول پرائمری میں بدلا۔ پرائمری سے وہ ہائی میں آیا اور ہائی سے وہ کالج کی منزل میں آیا۔ ایک منزل اور رہتی تھی کہ جہاں سب کچھ پڑھایا جاتا ہے اور وہ ہے قرآن مجید۔ جس کا یہ دعویٰ ہے کہ

لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (سورۂ انعام، آیت ۵۹)

"کوئی خشک وتر ایسی چیز نہیں ہے جو اس کتاب میں موجود نہ ہو"۔

تو اب خود اندازہ لگایئے کہ جس نرسری سکول کا استاد وہ خود معین کرتا ہے، اس کا نصاب بھی وہ خود معین کرتا ہے اور پھر وہ کالج تک پہنچتے پہنچتے ہر مقام پر، استاد بھی اس نے خود مقرر کیے، نصاب بھی اس نے خود مقرر کیا۔ اب عجیب بات ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ نصاب تو وہی ہے جو تمام علوم کا جامع ہے لیکن استاد ہم معین کریں گے۔

تو یہ بات کسی دنیا کے عقل مند کے سامنے رکھیے کہ جس کی ذات نے اس

سکول کی بنیاد رکھی تھی۔ جب زسری سکول میں وہ استاد تمہارا کیا؟ ملائکہ جیسی مخلوق کا انتخاب شدہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔تو جب وہ یونیورسٹی میں بدلہ تو کس طریقہ سے ہمارا مقرر شدہ استاد مقرر کرے گا۔

اور یاد رکھیے!

کہ پھر یہ کہ کتابیں تھوڑی آئیں اور استاد زیادہ آئے۔ درمیان میں ایسے وقفے بھی آئے کہ استاد تو تھے مگر کتابیں نہیں تھیں۔ ہم نے لوگوں سے سنا کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں کتاب کافی ہے۔ خدا نے عملی طور پر یہ بتایا کہ کتاب کے بغیر تو گزارہ چل سکتا ہے لیکن استاد کے بغیر گزارہ نہیں چل سکتا......(صلواۃ)

لہٰذا جو اس کا نمائندہ ہو اس میں دو صفات ہونی چاہئیں: ایک یہ کہ وہ اس کی یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہو، اس سے سند لے کر آئے اور وہاں بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ یہ کوئی معیار نہیں ہے۔ بس یہی ہے کہ اس کی طرف سے معین شدہ ہو، چاہے چند گھنٹے ہوئے ہوں اسے پیدا ہوئے۔

یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں بھی یہی ہوا اور پھر ایک منزل آئی کہ ایک بچہ کو اس نے بغیر باپ کے پیدا کردیا۔ لوگوں میں شک وشبہات پیدا ہوئے کہ یہ بچہ؟ کیوں کہ انہوں نے آج تک یہی دیکھا تھا کہ بغیر باپ کے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا جب بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے اس خاتون کو کہا کہ یہ بچہ کہاں سے لے کر آئی ہے۔ تو قرآن کہتا ہے کہ اس نے کہا کہ اس بچے سے پوچھ لو۔

وہ غصہ میں آئے کہ ایک تو یہ بچہ لے آئی اور دوسرا ہم سے مذاق کرتی ہے کہ بچے سے پوچھ لو۔ بس یہ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ گہوارے میں بچے نے کہا:

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ

''میں اللہ کا بندہ ہوں''۔

اٰتَانِیَ الْکِتَابَ

میں ایک عام بندہ نہیں ہوں بلکہ ''وہ کہ جو کتاب لے کر آیا ہوں''۔ خدا نے مجھے کتاب دی ہے۔

وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا

''اور مجھے نبی بنا کے بھیجا ہے''۔ (سورۂ مریم، آیہ ۳۰)

تو معلوم ہوا کہ ضرورت نہیں ہے کہ وہ آئے اور ایک عرصہ تک کسب کمالات کرے۔ پھر وہ نبی جا کر بنے گا۔ جب کہ وہ جن کی شریعتیں منسوخ ہونے والی تھیں، جن کے پروگرام وقتی تھے۔ ان کا یہ عالم ہے کہ وہ گہوارے میں کہتے ہیں کہ میں ابھی سے نبیؑ ہوں۔ تو وہ جو سب کا سردار ہے، جو سب سے اشرف و افضل ہے اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ چالیس سال تک اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

بہرحال ــــــ!

یہ بے انصافی ہے۔

تو بہرحال ــــــ!

یہ طے ہوگیا کہ ایک اور نبی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ حضرت یحیٰؑ علیہ السلام کے متعلق کہ:

وَاٰتَیْنَا الْحُکْمَ صَبِیًّا (سورۂ مریم، آیت ۱۲)

''کہ ہم نے ان کو حکومت اور فیصلے کی قوت بچپن میں دی''۔

یعنی ابھی بچہ تھا کہ وہ تمام احکامِ شریعت کے فیصلے دے سکتا تھا تو خدا کے نمائندے اس چیز کے محتاج نہیں ہیں کہ دنیا میں آ کر علم کسب کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نہ صرف علوم بلکہ تمام کمالات۔

ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے امام محمد باقر علیہ السلام کو شام میں بلایا۔ جب آپؑ تشریف لے گئے اور اسے معلوم ہوا کہ آپؑ شام میں آگئے ہیں تو اس نے اپنے دربار میں ایک تیراندازی کا مقابلہ رکھا۔ آپ کے دربار میں آنے سے پہلے وہاں انتظام کیا گیا۔ تیر و کمان لے کر لوگ جو تیر چلانے والے تھے ماہرین اس فن کے، جیسے آج کل کہ جو ہتھیار استعمال کیے جاتے ہیں ان میں مہارت ہونی چاہیے۔

اس زمانے میں تیر و کمان، تلوار یہ ہتھیار تھے لہٰذا ان میں مہارت ہونی چاہیے۔ انہوں نے سوچا کہ یہ تو صرف فتوے ہی دیتے ہیں، مسئلے ہی بتاتے ہیں لوگوں کو۔ انہیں کیا پتہ کہ تیر و کمان کیسے چلایا جاتا ہے۔

لہٰذا لوگوں کے سامنے میں ان سے کہوں گا کہ تم تیر چلاؤ اور وہ تو چلا نہیں سکتے۔ تو معاذ اللہ ان کی توہین ہوگی۔ تو جب آپؑ دربار میں تشریف لے آئے تو کہنے لگا کہ آپ تیر چلانا جانتے ہیں؟

فرمایا: کبھی چلایا نہیں ہے۔ وہ اور پکا ہو گیا کہ جس آدمی نے کبھی تیر چلایا نہیں ہے اس کو تو تیر و کمان پکڑنا ہی نہیں آئے گا۔ اس نے اپنے افسر سے کہا کہ ذرا تیر و کمان ان کو دے دو اور کہا کہ چلائیے۔

تو امامؑ نے اس نشانے کو دیکھا اور ایک تیر چھوڑا تو بالکل وسط نشانہ پر جا کر لگا۔ دوسرا تیر جو بالکل اس پہلے تیر کی جو پشت تھی اس کے اُوپر جا کر لگا۔ تیسرا اس

دوسرے کی پشت پر جا کر لگا۔

اسی طریقے سے سات یا نو تیر دو روایتیں ہیں مسلسل آپ نے تیر چلائے تو ایک لڑی تیروں کی بن گئی۔ روایت کے الفاظ ہیں کہ جب تیر لگتا تھا تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور کہنے لگا کہ آپ تو کہتے تھے کہ میں نے کبھی تیر چلایا ہی نہیں۔ اور ایسا تیر انداز تو آج تک دنیا میں آیا ہی نہیں۔ تو آپؑ نے فرمایا کہ ہم میں سے جو شخص امام ہوتا ہے وہ کمالات کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے وہ یہاں آ کر سیکھنے کا محتاج نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اشارہ کیا تھا کہ پیغمبرِ اسلام کے بارے مشہور یہی ہے کہ پیغمبرؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے یعنی آپؐ نے کبھی لکھا نہیں تھا لہٰذا لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ آپ لکھنا نہیں جانتے۔ اور یہ بات پکی ہو جاتی کہ اگر پیغمبرؐ جاتے جاتے آخری مرتبہ یہ نہ کہہ جاتے کہ لے آؤ قلم دوات تاکہ میں لکھ دوں۔

تو بہرحال ــــ!

دو چیزیں ان میں ہونی چاہئیں اور ایک قانونِ الٰہی کی پابندی ہونی چاہیے۔ اب وہ قانونِ الٰہی کی پابندی کس طریقے سے ہونی چاہیے کہ کبھی بھی جان بوجھ کر یا بھول چوک کر ان سے اس قانون کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ جس کو ہماری اصطلاح میں عصمت کہتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ خدا کا نمائندہ وہ ہوسکتا ہے کہ جو معصوم ہو۔

یاد رکھیے ــــ!

کہ ایک چھوٹے سے منصب پر جو فائز ہے، اس کی غلطی کا تعلق ایک چھوٹے سے دائرے سے ہوتا ہے۔ جتنا اس کا منصب بڑھتا جائے گا اتنا اس کی

غلطی کا اثر بڑھتا جائے گا۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ ایک آدمی سائیکل سوار ہے اگر وہ غلطی کرے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ اپنا سر پھوڑے گا۔ ایک آدھ اور آدمی کو بھی تکلیف پہنچ سکتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں اگر ایک کار کا ڈرائیور غلطی کرے تو تین چار آدمی متاثر ہوں گے اور اگر ایک بس کا ڈرائیور تو مثلاً پچاس آدمی مر سکتے ہیں۔ اگر ریل گاڑی کا ڈرائیور غلطی کرتا ہے تو وہاں کئی سو آدمی صدمے کا شکار ہو سکتے ہیں۔

جیسے مثلاً ایک ضلع کا کمشنر ایک غلطی کر بیٹھتا ہے تو ضلع کے اندر جو لوگ رہتے ہیں ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اگر کسی صوبہ کا گورنر ایک غلطی کرتا ہے۔ تو اس کا اثر پورے صوبے پر پڑ سکتا ہے۔ اگر ایک ملک کا سربراہ ایک غلطی کرتا ہے تو اس کا اثر اس ملک پر پڑ سکتا ہے۔ اگر ایک شخص پوری کائنات کے لیے نمائندہ قرار دیا گیا ہے تو اس کی غلطی جو ہے وہ پوری کائنات کو گھیرے گی۔ اگر ایک پوری نوعِ انسانی کا نمائندہ بنایا گیا ہے۔ اگر اس نے غلط کام کیا تو اس کا اثر پوری نوعِ انسانی پر پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ہو یا امام، وہ غلطی نہیں کرے گا۔ نہ وہ غلطی کرتا ہے اور نہ گناہ کرتا ہے۔

اور یہ تب ہو سکتا ہے کہ جب اس کا علم کامل ہو۔ بعض اوقات جان بوجھ کر ایک شخص غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ ہے کہ اپنے علم کی کمی کی وجہ سے غلطی کر بیٹھتا ہے۔ تو لہٰذا اس کا علم بھی کامل ہونا چاہیے اور اس کا کردار بھی اتنا بلند ہونا چاہیے کہ یہ شائبہ بھی نہ آ سکے کہ اس سے غلطی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے جتنے نمائندے آئے وہ عالم بھی تھے اور معصوم بھی تھے۔ تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جیسے پیغمبرؐ سے پہلے یہ سلسلہ چلتا تھا تو پیغمبرِؐ اسلام کے بعد اس سلسلہ کو اور اکمل ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ

وہ سلسلے وقتی تھے اور وہ پروگرام سارے وقتی تھے اور یہ پروگرام تا قیامِ قیامت ہے۔ لہٰذا تا قیامِ تک آنے کے جتنے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں وہ نمائندہ خدا ایسا ہونا چاہیے کہ جو تمام مسائل کو جانتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مولاؑ اور آقا کو جب پہلی مرتبہ منبر پر موقع دیا گیا تو ارشاد فرمایا:

اے لوگو! یہ سینہ علم کا گنجینہ ہے۔ یہ زبانِ رسول کی زبان چوس کر پلی ہے۔ اگر میرے لیے مسندِ علم بچھا دی جائے اور میں اس پر بیٹھ جاؤں تو توراۃ والوں کو توراۃ کے مطابق انجیل والوں کو انجیل کے مطابق، قرآن والوں کو قرآن کے مطابق ایسے حکم بتاؤں کہ ہر کتاب تصدیق کرے کہ حق وہ تھا کہ جو علیؑ نے کہا۔ (نعرۂ حیدری)

یہی وجہ ہے کہ مولاؑ ہمیشہ منبر پر ہی اعلان کرتے تھے کہ

سَلُونِی قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُونِی

"مجھ سے سوال کرو کہ قبل اس کے کہ مجھے مفقود پاؤ"۔

اور لوگوں کو گویا ترغیب دلاتے تھے کہ سوالات ضروری نہیں ہیں کہ اپنے مسائل اور زمین کے بارے میں پوچھو بلکہ کہا:

فَاِنِّی اَعْلَمُ بِطُرُقِ السَّمٰوٰتِ مِنْ طُرُقِ الْاَرْضِ

"میں آسمانوں کے راستوں کو بھی زمین کے راستوں سے بہتر جانتا ہوں"۔

ایک شخص کھڑے ہو کر سوال کرتا ہے کہ مولاؑ یہ بتائیے کہ اس وقت جبرئیلؑ کہاں ہے؟

تو امامؑ نے اُوپر دیکھا، نیچے دیکھا اور دائیں بائیں دیکھ کر کہا کہ تو ہی

جبرئیلؑ ہے۔ تو وہ فوراً ہی اڑا اور مسجد کی چھت پھاڑتا ہوا بلندیوں میں چلا گیا۔

تو اب فرشتے میں یہ طاقت ہے کہ اگر وہ چاہے تو ایک قطرہ بھی بن سکتا ہے، ایک تنکا بھی بن سکتا ہے، کیونکہ وہ لطیف جسم ہے، کثیف جسم نہیں ہے کہ سمٹ نہ سکے۔ اور اگر پھیلنا چاہے تو وہ پوری کائنات پر بھی وسعت پیدا کر سکتا ہے۔

تو اب علیؑ نے دیکھا اوپر کی طرف تو یہ نہیں ہے کہ موٹی موٹی چیزوں کو دیکھتے گئے بلکہ جہاں جہاں تک جبرئیلؑ جا سکتا تھا وہاں کے ہر ہر ذرّے، ہر ہر قطرے، ہر ہر نقطے کو علیؑ نے چھان چھان کر دیکھا۔ اسی طریقے سے مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے بعد کائنات کو دیکھا۔

یعنی لوگ امیرالمومنینؑ کے فیصلوں سے حیران اور پریشان ہو جاتے تھے کہ کس طریقے سے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ نے ایک مرتبہ کہہ دیا: یا علیؑ! کیا وجہ ہے آپ سوچتے نہیں ہیں، بغیر سوچنے کے جب آپ سے سوال کیا جائے تو فوراً جواب دے دیتے ہیں۔

تو فرمایا کہ یہ بتاؤں کہ تمہارے ہاتھ کی انگلیاں کتنی ہیں؟

کہنے لگا: پانچ۔

آپؑ نے فرمایا کہ تو نے سوچا کیوں نہیں؟

کہنے لگا: یہ تو واضح ہیں۔ اس میں سوچنے کی بات نہیں ہے۔

فرمایا: جس طرح تمہارے سامنے ہاتھ کی انگلیاں واضح ہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس طریقے سے میرے سامنے واضح ہے۔ (نعرۂ حیدری)

تو یہ عظمت تھی اس خاندان کی علم کے لحاظ سے اور رہا ان کی عصمت و طہارت کا مسئلہ تو دنیا نے پوری کوشش کی کہ کوئی عیب ان میں نکال لیں، کوئی شخص

ان میں عیب نہ نکال سکا اور کس طریقے سے نکال سکتا تھا؟

یاد رکھئے!

کہ ہمارے ہاں ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اُن کا جو بچہ پیدا ہو، اس کا اچھے سے اچھا نام رکھا جائے۔ ہر آدمی کوشش کرتا ہے۔ پرانے زمانے میں تو مذہبی لوگ تھے لہٰذا وہ انبیاءؑ اور آئمہ یا خدا کے نام سے کسی نام کو ملا کر رکھتے تھے۔ اب روشنی کا زمانہ ہے۔ لہٰذا لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی نیا نام ہونا چاہیے۔ چاہے اس کا کوئی مفہوم بنتا ہو یا نہ بنتا ہو۔

بہرحال ــــ!

عجیب عجیب سے نام ہوتے ہیں جو مجھے آتے بھی نہیں ہیں۔ لیکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا نام رکھا جائے اس لیے کہ ہر شخص کے ذہن میں ہے کہ اگر نام اچھا ہوگا تو اس کے کام بھی اچھے ہوں گے۔ لیکن ضروری نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات تو ہم سے بھی لوگ آ کر پوچھتے ہیں کہ کوئی پیر فقیر کہتے ہیں کہ ستاروں سے کوئی نام نکلتے ہیں۔

تو بہرحال ــــ!

کوشش یہی ہوتی ہے کہ اچھا نام رکھا جائے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اچھے اچھے نام کے ساتھ اس کے اچھے کام بھی ہوں۔ بعض اوقات آپ بچے کا نام عقیل رکھ لیتے ہیں اور وہ بڑا ہو کر پاگل ہو جاتا ہے۔ ایک آدمی کا آپ عالم نام رکھ دیتے ہیں لیکن بڑے ہو کر وہ جاہل بن جاتا ہے۔ ایک آدمی کا نام آپ جمیل رکھ دیتے ہیں اور وہ بدصورت ہو جاتا ہے لیکن اگر خدا کسی کا کوئی نام رکھے۔ پھر تو یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ نام کچھ رکھے اور اس کے کام کچھ ہوں۔

تو ایک خاندان ہے دنیا میں کہ جن کے بچوں کے نام وہ گھر والے نہیں رکھتے بلکہ خدا رکھتا ہے۔ سرکارِ رسالتؐ کی ولادت ہوئی، تو غیب سے بتایا گیا کہ اس کا نام یہ رکھنا۔ اور جب آپ کے آقا و مولاؑ پیدا ہوئے اور پیدا بھی وہاں ہوئے جہاں آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ اور پھر یہ بتانے کے لیے کہ یہ اتفاقی بات نہیں تھی۔ کعبہ کو تالا بھی لگا ہوا تھا۔ اندر کوئی نہیں جاتا تھا اور اب بھی تالا لگا ہوا ہے۔ اور کسی کو اندر نہیں جانے دیتے۔

اور سارے جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ ایک نشیبی زمین ہے اور مکے کی عمارتیں کافی دُور دُور ہیں۔ کم از کم ایک فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ اب ایک خاتون کا اپنا گھر چھوڑ کر بلندی سے اس عالم میں ایک پستی کی طرف جانا، نشیب کی طرف جانا یہ خود ایک مسئلہ ہے لیکن وہ گئیں، جو کیفیت ان کو محسوس ہوئی تو اصولی طور پر ان کو تو گھر کی طرف پلٹنا چاہیے تھا۔

لیکن روایت بتاتی ہے کہ انہوں نے اپنے جسم کو خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ مَس کیا اور بارگاہِ خداوندی میں دعا کی کہ پالنے والے تجھے اس گھر کی قسم اور اس کے بنانے والے کی قسم اور اس بچے کی قسم! جو میرے شکم میں ہے۔ میری مشکل کو آسان فرما۔

ابھی یہ دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ دیوارِ کعبہ پھٹ گئی۔ جب پھٹ گئی تو آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ کسی مکان کے قریب بیٹھے ہوئے ہوں اور اس کی دیوار پھٹ جائے تو آپ مکان کے قریب جائیں گے یا دُور ہٹیں گے۔ ظاہر ہے کہ دُور ہوں گے لیکن وہ خاتون کہ بجائے اس کے کہ وہ دُور ہو جائے وہ اس مکان کے اندر داخل ہوئی۔ جب اندر داخل ہو گئی تو دیوار پھر مل گئی۔

اب حاجی صاحبان جانتے ہیں کہ اللہ کے اس کوٹھے کا تو روشن دان بھی نہیں ہے۔ لہذا وہاں ہوا کا کوئی گزر نہیں ہے۔ دروازہ بھی اتنا مضبوط ہے کہ اس میں بھی سوراخ نہیں ہے۔ بالکل بند، ہر طرف سے بند۔

اب کم از کم اتنا سوچتی کہ تنگ مکان ہے، نہ اس میں کھانا ہے نہ پینا ہے، نہ کوئی خاتون ساتھ ہے جو اس حالت میں ان کی خدمت کرے۔ تو ان کا اندر چلے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اس پروگرام کا علم تھا۔ لہذا بے فکر ہو کر اندر چلی گئیں۔ دیوار پھر بند ہو گئی۔

اور ان کے خاندان کے جناب عباسؑ ابن عبدالمطلب بھی وہاں پر موجود تھے۔ انہوں نے چابی منگوائی اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ تو اب دروازہ بھی نہیں کھلا۔ چنانچہ تین دن تک وہ اندر رہیں۔ کم از کم تین دن ایک خاتون بند مکان میں ہے تو گھر والوں کو فکر ہونی چاہیے۔ اگر اس کو نہیں نکال سکتے تو چھت توڑنی چاہیے۔ ایسا کچھ نہیں کیا تو اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں بھی پتہ تھا۔ سب پروگرام کا پتہ تھا لہذا خاموشی سے گھر میں بیٹھے رہے۔ تین دن کے بعد پھر دروازہ اسی مقام سے کھلا جہاں پہلے دیوار پھٹی تھی اور جناب فاطمہؑ بنت اسد اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں پر لیے ہوئے یہ کہہ رہی تھیں کہ مجھے اولین و آخرین کی عورتوں پر فضیلت بخشی گئی۔ مجھے تین دن خانہ خدا میں مہمان رکھا گیا اور جنت کے میوے اور کھانے مجھے دیے گئے اور جب میں آنے لگی تو میرے کان میں آواز آئی کہ اس بچے کا نام علیؑ رکھنا۔ (نعرۂ حیدری)

تو اب ماں باپ نے نام نہیں رکھا بلکہ جس کا گھر تھا اس نے نام رکھا۔ لیکن باپ نے مزید اس چیز کو واضح کرنے کے لیے کہ ہم نے نام نہیں رکھا جناب

فاطمہؑ بنت اسد کو لے کر بطحا کی وادیوں میں بارگاہِ ایزدی میں مناجات کیں۔ لہٰذا تو بتا کہ اس کا نام کیا رکھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے دیکھا کہ آسمان کی طرف سے ایک نورانی چیز ان کی طرف آ گئی۔ آہستہ آہستہ جب قریب آئی تو انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا تو وہ ایک سبز رنگ کی تختی تھی۔ اس کے اُوپر دو شعر لکھے ہوئے تھے:

کہ اے ابوطالب اور اے فاطمہ بنت اسد! تمہیں ایک ایسے بچے کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے کہ جو پاک و پاکیزہ ہے۔ اور خدا علی الاعلیٰ نے اپنے نام سے مشتق کر کے اس کا نام علیؑ رکھا ہے۔ (نعرۂ حیدری)

اور اب جب نام علیؑ ہے اور رکھا بھی خدا نے ہے تو اس کی خصوصیات ہیں۔ وہ اس میں ہونی چاہئیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علیؑ کا معنی کیا ہے۔

یاد رکھئے کہ عربی زبان میں ایک لفظ ہے "علم" اور اس کا معنی ہے جاننا اور اس کا اسم فاعل ہے "عالم"۔ جس کا معنی ہے جاننے والا۔ لیکن اگر اس کا ہم "علیم" بنا لیں تو اس کا معنی بن جاتا ہے بہت زیادہ جاننے والا۔

اسی طرح ایک لفظ ہے قدرت جس کا معنی ہے توانائی۔ اس سے اسم فاعل بنتا ہے "قادر"۔ اس کا معنی ہے صاحبِ قدرت۔ لیکن اگر "قدیر" بنائیں تو اس کا معنی ہے زیادہ قدرت رکھنے والا۔

اسی طرح ایک لفظ ہے "علو" اور اس کا معنی ہے بلندی۔ اس کا اسم فاعل بنائیں تو "عالی" بنتا ہے۔ عالی کا معنی بلند اور اگر اس کو "علی" بنائیں تو اس کا معنی ہے بلند تر۔ تو اب خدا نے آپ کے مولاؑ کا نام رکھا ہے "علی"۔ بلند تر تو جب اس نے اس کا نام بلند تر رکھا ہے تو ظاہر ہے یہ نہیں رکھا کہ اس کا نام صرف

"علیم" ہو کہ صرف اس میں علم کی صفت ہو، "قدیر" ہو تو صرف قدرت کی صفت ہو، بلکہ "علی" رکھا ہے بلند تر۔ یعنی ہر صفتِ کمال میں، کوئی مخصوص صفت نہیں بلکہ جو جو بھی صفتِ کمال ہو سکتی ہے اس صفتِ کمال میں علیؑ صرف بلند ہے بلکہ بلند تر ہے۔

تو علیؑ ہر صفتِ کمال میں صرف بلند نہیں ہے بلکہ بلند تر۔ جتنا دنیا نے انھیں پست، گھٹانے کی کوشش کی، ان کے خلاف ہر سازش کی لیکن خدا نے ان کو بلند تر پیدا کیا تھا لہٰذا وہ بلند تر رہا۔ کوئی اس کو پست نہ کر سکا۔ بلندی ہی بلندی اس میں تھی۔ جتنی بڑی سازش علیؑ کے ساتھ ہوئی اتنی بڑی اگر دنیا کے کسی اور آدمی کے ساتھ ہوتی تو اس کا نام ونشان مٹ جاتا۔ لیکن علیؑ کا کمال تھا کہ جس کو خالق کائنات نے بلند تر ہونے کا لقب دیا تھا۔

جتنی بھی ان کی مخالفت کی گئی، ان کے خاندان کو مٹانے کی کوشش کی گئی، اُن کے فضائل کو ختم کرنے کی کوشش کی چنانچہ ایک عالم ہے وہ کہتا ہے کہ عجیب بات ہے کہ علیؑ کے فضائل دوستوں نے بھی چھپائے، اپنی جان کے ڈر سے اور دشمنوں نے بھی چھپائے بغض وحسد کی بنا پر لیکن اب بھی پوری دنیا علیؑ کے فضائل سے بھری ہوئی ہے۔ (نعرۂ حیدری)

ذکرِ مصائب: شہادت حضرت مولا عباس علمدارؑ

علیؑ ہر صفت میں بلند تر ہے۔ علیؑ کو اولاد ملی تو بلند تر ملی، تلوار ملی تو بلند تر، خاندان ملا تو بلند تر۔ وہ اولادِ علیؑ جو معصومؑ ہے وہ تو الگ ہے۔ ان کے علاوہ اگر علیؑ کے بیٹے دیکھیں تو اپنے اپنے مقام پر بلند وبالا نظر آئیں گے۔ آپؑ کے ایک وہ بیٹے ہیں کہ جن کی خود علیؑ کو خواہش تھی۔ چنانچہ ایک دن امیرالمومنینؑ متفکر بیٹھے

تھے اور جناب عقیلؑ آپؑ کے بھائی آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

فرمایا: بھائی! کیا سوچ رہے ہو؟

کہا: بھائی دل چاہتا ہے کہ کسی ایسی خاتون سے شادی کروں جس کا خاندان بہادر اور شجاع ہو۔

کہا: بھائی کیوں؟

فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ خالقِ کائنات اس خاتون سے مجھے ایک بیٹا عطا کرے جو کربلا میں میرے حسینؑ کے کام آئے۔ چونکہ جناب عقیل نسابِ عرب تھے اور عرب کے خاندانوں کی خصوصیات سے واقف تھے۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا کہ میری نگاہ میں پوری دنیائے عرب میں جناب فاطمہ بنت حزام سے بہتر کوئی خاتون نہیں ہے جیسے حسنینؑ کی ماں کا نام فاطمہؑ ہے۔ اس طریقے سے عباسؑ کی ماں کا نام بھی فاطمہ ہے۔ یہ اُم البنین ان کی کنیت ہے۔ اُم البنین کا معنی ہے یعنی بیٹوں کی ماں۔ چار بیٹے تھے جو چاروں کربلا کے میدان میں شہید کردیئے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے ان کی شہادت کے بعد جناب اُم البنین جنت البقیع میں اس امام بارگاہ میں جاتی تھیں جو جناب سیدہؑ کے لیے تعمیر کیا گیا تھا اور وہاں جاکر کربلا والوں کے مصائب بیان کرتی تھیں۔ وہاں جو مرثیہ پڑھتی تھیں تو ایک مرثیہ ہمیں کتابوں سے ملا ہے۔ اس مرثیہ میں کہتی ہیں کہ اب مجھے اُم البنین نہ کہا کرو، اس لیے کہ اُم البنین کا معنی تو بیٹوں کی ماں ہے۔ میرے شیر جیسے چار بیٹے تھے جو کربلا میں شہید کردیئے گئے۔

اور بعض روایات میں ملتا ہے کہ پہلے وہ چار قبریں بناتی تھیں اپنے چاروں بیٹوں کی۔ پھر ان کو مٹا دیتی تھیں۔ اور پھر ایک قبر بناتی تھیں اور کہتی تھیں کہ بیٹے تم

ناراض نہ ہوتا، میں تم پر گریہ نہیں کرتی اس لیے کہ تمہاری ماں تو زندہ ہے۔ میں اس حسینؑ پر گریہ کرتی ہوں کہ جس کی ماں اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔

عزادارو.....!

کربلا کے میدان میں لشکر کے میدان میں جانے کی ترتیب اور پیغمبرؐ اسلام اور امیرالمومنینؑ کی ترتیب سے مختلف تھی، کیوں کہ پیغمبرؐ اسلام کا دستور بھی یہی تھا کہ جب جنگ ہوتی تھی تو اپنے خاندان کے افراد کو پہلے بھیجتے تھے۔ جناب امیرالمومنینؑ بھی ایسا کرتے تھے۔

لیکن کربلا کے میدان میں حسینؑ نے نظام ذرا بدل دیا اور حسینؑ کے اصحاب بھی اتنے باوفا تھے کہ انہوں نے کہا کہ جب تک ہماری جان میں جان ہے ہم خاندانِ رسولؐ کے کسی جوان کو جانے نہیں دیں گے۔ ایک تو وجہ یہ تھی اور دوسرا مولانا علی نقی صاحب کا یہ جملہ مجھے بڑا پسند آیا کہ دوسری وجہ یہ تھی کہ کربلا میں مرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا جینا مشکل تھا۔

لہٰذا جس میں جتنی برداشت تھی اس کو اتنی دیر زندہ رکھا گیا اور جب کوئی نہ رہا تو جناب عباسؑ امام مظلومؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مولاؑ! اب تو بچوں کی العطش کی آواز بیٹھنے نہیں دیتی۔ مجھے اجازت دیجیے۔

امامؑ نے فرمایا کہ بھیا! تم تو میرے لشکر کے علم دار ہو، اگر علم دار ہی نہ رہے تو فوج کیا ہوگی۔

عرض کیا کہ مولاؑ وہ فوج ہے کہاں جس کا میں علم دار ہوں؟ مجھے اجازت دیجیے۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔

امامؑ نے فرمایا: اچھا بھائی تم جاؤ بچوں کے لیے پانی لے آؤ۔ جناب عباسؑ

نے مشکیزہ اٹھایا اور میدان کی طرف چلے اور مولاؑ کا حکم تھا کہ پانی لے آؤ۔

عزادارو___!

جو لوگ کربلا گئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا کہ ایک طرف خیام گاہ ہیں، درمیان میں میدانِ جنگ تھا۔ اِدھر فوج تھی اور فوج کی پشت پر دریا تھا۔ یعنی ان کے پیچھے دریا تھا۔ جس نے دریا کی طرف جانا ہے تو اس نے ساری فوج کو چیر کر جانا ہے۔ وہ فوج کہ جس کی تعداد ۳۰ ہزار سے ۶ لاکھ تک لکھی ہوئی ہے۔ کم از کم جو مؤرخین نے لکھی ہے وہ ۳۰ ہزار ہے۔ ۷۰ ہزار بھی لکھی گئی ہے، دو لاکھ بھی لکھی گئی ہے۔

بہرحالّ___!

اگر فرض کرلیا جائے کہ کم از کم ۳۰ ہزار فوج تھی تو ۳۰ ہزار آدمی کوئی تھوڑے نہیں ہوتے۔ چنانچہ جب عباسؑ جنگ کر رہے تھے تو ایک ملعون نے کہا کہ بدبختو! تمہیں کیا ہوگیا ہے، اگر تم ایک ایک مٹھی یہ لفظ ہیں تاریخ کے۔ ایک ایک مٹھی مٹی بھی پھینکو اس کی طرف تو وہ اس کے نیچے دب جائے گا۔ لیکن علیؑ کے لال کے تین دن کی بھوک اور پیاس کے باوجود ایسی جنگ کی کہ میدان خالی ہوگیا اور عباسؑ نے اپنا گھوڑا فرات میں داخل کرلیا اور مشک پانی سے پُر کرلی، پانی چلو میں لے لیا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ چونکہ تین دن کے پیاسے تھے اور پانی پینا چاہتے تھے اور جب حسینؑ کی پیاس یاد آئی تو پانی پھینک دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مؤرخ عباسؑ کے پاس تو نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ عباسؑ اس فوج کو دکھا رہے ہوں کہ اے لعینو! جس پانی پر تم اتراتے تھے بتاؤ اب وہ پانی کس کے قبضہ میں ہے۔

لیکن باوجود پانی ہاتھ میں ہونے کے میں پیوں گا نہیں اس لیے کہ سکینہؑ پیاسی ہے، اصغرؑ پیاسا ہے، حسینؑ پیاسا ہے، زینبؑ و اُم کلثومؑ پیاسی ہیں تو عباسؑ کیسے پانی پی سکتا ہے؟

چنانچہ پانی مشک میں بھر کر عباسؑ پلٹے۔ اب پوری فوج سمٹ کر آ گئی۔ پوری فوج کی کوشش یہ تھی کہ کسی طریقے سے پانی خیام تک نہ جائے اور اب اکیلے کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طریقہ سے میں پانی کو خیمے تک پہنچا دوں۔

عزادارو!

کوشش کرتے کرتے آخر ان ملاعین نے محسوس کیا کہ جب تک عباسؑ کے بازو سلامت ہیں۔ اس وقت تک ہم مشک ان سے نہیں چھین سکتے۔ ایک ظالم نے چھپ کر ایسا وار کیا کہ دایاں بازو قلم ہوگیا۔ دوسرے نے وار کیا بایاں بازو قلم ہوگیا۔ لیکن باوجود اس کے کہ نہ تو عباسؑ نے علم کو گرنے دیا اور نہ مشک کو گرنے دیا۔ علم آپ نے کٹے ہوئے بازوؤں کے ساتھ سینے سے چمٹا لیا اور مشک کے تسمیں آپ نے اپنے منہ میں لے لیے۔

اب بھی عباسؑ مشک کو بچا رہے تھے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ جدھر سے تیر آتا تھا عباسؑ جھک جاتے تھے کہ تیر میرے جسم پر لگیں اور مشک بچ جائے۔ آخر ایک تیر آیا کہ عباسؑ کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مشک میں تیر لگا۔ اِدھر مشک میں تیر لگا اور اُدھر ایک ظالم نے گُرز کا ایسا وار کیا کہ عباسؑ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے۔

آپؑ نے دیکھا ہوگا کہ گھڑسوار جب زمین پر گرتے ہیں تو ہاتھوں کے سہارے گرتے ہیں۔ تصور کریں کہ کربلا کے میدان میں عباسؑ گھوڑے کی زین سے گر رہے ہیں لیکن ان کے بازو قلم ہوگئے ہیں۔ عباسؑ اِدھر زمین پر گرے اُدھر

حسینؑ گرے۔ کمر تھام کر زہراؑ کا لال میدان کی طرف چلا اور یہ کہتا ہوا چلا:

"اے عباسؑ! تیری موت سے حسینؑ کی کمر ٹوٹ گئی"۔

حسینؑ نے عباسؑ کا سر زانو پر رکھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں بھائی راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد جناب حسینؑ نے دیکھا، عباسؑ کو ہچکیاں آنے لگیں۔ دستور کے مطابق چاہا کہ عباسؑ کی لاش کو خیمے میں لے جائیں۔ جب جناب عباسؑ نے یہ کیفیت دیکھی تو کہا:

مولاؑ! مجھ پر ایک احسان کر دیں۔

حسینؑ نے کہا کہ وہ کیا؟

عباسؑ نے کہا کہ میری لاش کو یہیں رہنے دیجیے گا۔

حسینؑ نے کہا کہ میرا تو دستور ہے کہ ہر شہید کی لاش خیام میں لے گیا ہوں۔

عباسؑ نے کہا: مولاؑ! میری لاش کو یہاں رہنے دیں۔

حسینؑ نے کہا: کیوں عباسؑ؟ ابھی تو حسینؑ زندہ ہے۔

عباسؑ نے کہا: مولاؑ! مجھے سکینہؑ سے شرم آتی ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ تجھے پانی پلاؤں گا لیکن ہائے عباسؑ!

عباسؑ سکینہؑ کو پانی نہ پلا سکا۔ عباسؑ کی شہادت ہوئی۔ حسینؑ نے علم ہاتھ میں لیا۔ خیام کی طرف بڑھے۔ بیبیاں اور بچے دروازے پر جمع ہو گئے۔ علم قریب آتا جا رہا تھا، بچے آگے بڑھ رہے تھے لیکن اچانک بچوں نے دیکھا کہ علم تو آیا لیکن علمدار نہ آیا۔

●……●……●

مجلس ہشتم

- اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کا اس دنیاوی انسانی زندگی کے ساتھ بھی تعلق ہے اور اُخروی زندگی کے ساتھ بھی۔
- جو کسی بولنے والے کی آواز کی طرف کان دھرے تو اس نے اس کی عبادت کی۔
- اس دنیا کا نظام دو چیزوں پر چل رہا ہے: ایک علم ہے اور ایک عمل ہے۔
- جو اُن کے نام پر چار ٹکے نہیں دے سکتے، انہوں نے جان کیا دینی ہے؟
- ہمیں برداشت کرو، پھر دیکھو یہاں اسلام آتا ہے یا نہیں آتا۔
- کیا کوئی امامؑ ایسا تھا جو ڈاڑھی منڈواتا تھا؟

ذکرِ مصائب شہادت جنابِ علی اصغرؑ

- کوئی ہماری مدد کرنے والا ہے؟ کیا کوئی ہماری فریادرسی کرنے والا ہے؟
- اگر مجھ پر رحم نہیں آتا تو کم از کم اس چھ ماہ کے بچے پر تو رحم کرو۔

مجلسِ ہشتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارشادِ رب العزت ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (سورہ آل عمران، آیہ ۱۹)

"جو یقیناً اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے"۔

دوستو اور بزرگو!!

جیسا کہ بارہا میں آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں اور آپ کو بھی اس بات کا علم ہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا اس دنیاوی انسانی زندگی کے ساتھ بھی تعلق ہے اور اخروی زندگی کے ساتھ بھی۔

بچہ جب شکمِ مادر میں نشو و نما پاتا ہے اس وقت سے لے کر جب قبر میں پہنچ جاتا ہے اس کی زندگی کے ہر ہر لمحے کے ساتھ دین کا تعلق ہے۔ وہ بازار میں ہو تب بھی اس کے ساتھ دین کا تعلق ہے۔ وہ دفتر میں بیٹھا ہوا ہے تب بھی اس کے ساتھ دین کا تعلق ہے۔ وہ کسی محکمہ سے تعلق رکھتا ہے، کسی صنف سے تعلق رکھتا ہے، کسی قوم سے تعلق رکھتا ہے، ہر حالت میں دین کا اس کے ساتھ تعلق ہے۔

اب جس طرح ہم زندگی بسر کرتے ہیں، اب دین کو اپنانے میں یہ نہیں

ہے کہ زندگی میں کوئی لمبی چوڑی تبدیلی آجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو جو خدا نے فکر دی ہے اس سے وہ سوچتا ہے۔ آنکھیں دی ہیں اس سے دیکھتا ہے، کانوں سے سنتا ہے، زبان سے بولتا ہے، ہاتھ سے کام کرتا ہے، پاؤں سے چلتا ہے۔

کام وہی ہیں مگر صرف یہ ہے کہ ان اعضاء و جوارح سے کام لیتے وقت بس پہلے یہ سمجھ لے اور سوچ لے کہ آیا ان کا فعل مرضیِ خالق کے برخلاف تو نہیں ہے۔ تو اگر خالقِ کائنات کے حکم کے تابع کر رہا ہے۔ اس کے حکم کے مطابق کام کر رہا ہے تو اگر وہ بازار میں بیٹھا ہے تب بھی وہ عبادت کر رہا ہے۔ اگر کسی دفتر میں ہے تب بھی وہ عبادت کر رہا ہے، وہ کسی منزل پر ہو۔

یہی وجہ ہے کہ صادقِ آلِ محمدؐ کا ارشاد ہے کہ جو کسی بولنے والے کی آواز کی طرف کان دھرے تو اس نے اس کی عبادت کی، اگر بولنے والا اللہ کی طرف سے بول رہا ہے تو اللہ کی عبادت کر رہا ہے۔ اور اگر وہ شیطان کی طرف سے بول رہا ہے تو پھر وہ شیطان کی عبادت کر رہا ہے۔

تو آپ کسی کی بات کی طرف کان دھرتے ہیں یا کسی طرف دیکھتے ہیں، کوئی عمل کرتے ہیں تو بس اگر رضائے الٰہی کے تابع ہے اور حکمِ خدا کے مطابق ہے تو آپ عبادت کر رہے ہیں۔

اب آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا کا نظام دو چیزوں سے چل رہا ہے۔ ایک علم ہے اور ایک عمل ہے۔ پہلے کسی کام کو جاننا ہے اور جاننے کے بعد اس کے مطابق عمل کرنا ہے تو اب اگر جاننے کی منزل ہی نہ آئے تو ظاہر ہے کہ عمل کی منزل ہی نہیں آسکتی تو لہٰذا جو کام انسان کرنا چاہتا ہے پہلے وہ اس کو جانے۔ یہ بات طے ہے کہ دنیا میں جتنی اقوام ہے، جتنی قوموں نے ترقی کی ہے، وہ علم و عمل

کی بنا پر کی۔ وہ علم و عمل اگر اس کا دنیا کے ساتھ تعلق ہے تو دنیاوی ترقی ہوگی اور اگر اس علم و عمل کا خدا کو مدنظر رکھ کر اس کو بجا لایا جائے تو دنیا میں بھی ترقی حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی انسان فلاح و بہبود سے ہمکنار ہوگا۔

تو اس سلسلے میں مجھے کہا گیا تھا اور میں معذرت خواہ ہوں کہ میرے ذہن میں نہیں رہا تھا۔ یہاں اس گلی میں ایک ادارہ مصطفیٰ ٹرسٹ کے نام پر بنایا گیا ہے کہ جن کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو جہاں جدید تعلیم سے آراستہ کیا جائے وہاں ان کو دینی تعلیم بھی دی جائے۔

تو یہ ادارہ اور اس قسم کے مختلف ادارے مختلف جگہوں پر یا آپ خود کھولیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قومی زندگی کی علامت ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ قوم زندہ ہے۔ تو ان سے فائدہ بھی اٹھانا چاہیے، اور ان کے ساتھ تعاون بھی کرنا چاہیے اور یہ تو ان کا معاملہ ہے۔ رہا ہمارا معاملہ اور ظاہر ہے کہ میرا لاہور میں مجالس پڑھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کو آپ کے اس محبوب ادارے کی طرف میں متوجہ کروں کہ دنیا تو بہرحال کیا کچھ کہتی ہے لیکن آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ وہ اہلِ لاہور اور خصوصاً خواجگان نارووالی کی مدد سے جو ایک کرایہ کا مکان تھا، وہ پاکستان میں شیعوں کا ایک مرکز بن چکا ہے جس کا نام جامعۃ المنتظر ہے۔

ٹھیک ہے کہ اسی کی ترقی میں تقریباً ۳۰ سال کا عرصہ لگا ہے اور یہ میں نے جان بوجھ کر لگایا ہے۔ تقریباً ۲۰ سال مجھے ہوگئے اس کو سنبھالے ہوئے۔ تو لاہور میں شاید ہی شیعوں کا کوئی گھر ہو کہ جس کا دروازہ میں نے خود جا کر نہ کھٹکھٹایا ہو کہ اس کے ساتھ تعاون کریں۔

تو بہرحال ــــــ!

آپ کے تعاون سے کافی حد تک وہ بن چکا ہے اب بھی اس میں کچھ عمارتیں رہتی ہیں۔ تو یہ اتنا عرصہ ۲۰ سال کا کیوں ہوا؟ حالانکہ لوگ اِدھر اُدھر سے امداد لینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میں نے یہ سوچا ہے کہ اپنی ہی قوم کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا عادی بنایا جائے۔ شاید میری یہ بات آپ کو اچھی نہیں لگی؟ آپ کی خاموشی سے پتہ چلا ہے۔ (صلوٰۃ)

تو میرے محترم ـــــ!

اس لیے کہ کوئی قومی ادارے اسی وقت ہی صحیح طور پر چل سکتے ہیں جب قوم میں شعور ہو کہ ہم نے خود چلانے ہیں۔ مثلاً آپ کا ایک مرکز تھا لکھنؤ میں۔ دوسو سال تک وہ مرکز رہا۔ اس کو مختلف نواب مل کر چلاتے تھے۔ عوام کے ساتھ اس کا کوئی لنک نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب نوابوں کی نوابیاں ختم ہوگئیں تو مرکز تنزل کا شکار ہوگیا اور اس کی جڑیں چونکہ عوام میں نہیں تھیں لہٰذا عوام وہاں کی عادی ہی نہیں تھی اس پر پیسہ خرچ کرنے کے لیے۔ یہاں بھی مثلاً ہمارے مال دار طبقہ میں سے یہ نواب لاہور تھے۔ انہوں نے بڑی خدمتِ دین کی ہے مذہب اہلِ بیتؑ کو پھیلانے میں۔ لیکن ان کی پبلک یعنی اب وہ بھی دین سے ہٹ گئی ہے تو پبلک میں چونکہ شعور نہیں تھا تو نتیجہ یہ ہے کہ علاقہ نواب صاحب کی مسجد میں پیش نماز نہیں ہے۔ کافی تعداد میں شیعہ وہاں بستے ہیں اس لیے کہ انہوں نے ان میں شعور ہی نہیں پایا۔ اس لیے ہم نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ اگر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا شعور پیدا نہ ہو اُن میں تو اُن سے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

یہ باہر کی امدادیں، کوئی نواب دے گا وغیرہ فلاں جگہ سے ایڈ آجائے گی تو اس سے نہ قومی ادارے چلے ہیں نہ چل سکتے ہیں۔

اب ایران میں، یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس پیسہ زیادہ ہے اور آپ کے پاس نہیں ہے۔ اگرچہ میں عموماً کہتا رہتا ہوں کہ دو قومیں خدا کا شکر کبھی بھی ادا نہیں کرتیں: ایک ہم مولوی اور ایک تاجر حضرات۔ مولوی کے پاس بھی جب جائیں تو وہ اپنا ہی رونا روئے گا اور تاجروں سے پوچھیں تو وہ بھی کہتے ہیں کہ مندہ ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ جب مولوی پوچھ رہا ہے تو کچھ مانگے گا۔ اگر اپنی کوٹھی بنانی ہو تو پھر پندرہ یا بیس لاکھ کا بھی مندہ نہیں ہے لیکن جب ان سے کہا جائے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرو۔

اگر ایرانیوں کی طرح آپ بھی صرف خمس کے عامل ہو جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ جتنے دینی اور مذہبی کام ہیں وہ بغیر کسی زحمت کے پورے ہو سکتے ہیں۔

اب ملازمین ہیں چاہے ان کا دس روپے ہی سال کے بعد مالِ امامؑ نکلے یا مالِ خمس نکلے تو کوئی بھی ایسا آدمی نہیں ہے کہ جس کا دس روپے بھی خمس نہ نکلتا ہو۔ جو بھی کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے۔ اس لیے ہم نے تو کبھی حساب ہی نہیں کیا۔ اور ہم جناب اہلِ بیتؑ پر قربان ہیں۔ امامِ زمانہؑ کا ظہور ہو جائے تو ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے۔ جو اُن کے نام پر چار ٹکے نہیں دے سکتے انہوں نے جان کیا دینی؟

اور تین سو تیراں آدمی صحیح معنوں میں ہر حکمِ امامؑ کی اتباع کرنے والے پیدا ہو جائیں تو امامؑ کا ظہور ہو جائے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جیسے وہ چاہتے ہیں ویسے ابھی تک نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو یقیناً ظہور ہو جاتا۔

بارہا میں عرض کر چکا ہوں کہ جیسے نماز اہم ترین واجبات میں سے ہے اسی طرح مالیات بھی جو دینی مالیات ہیں اور اگر وہ ادا نہ کیے جائیں تو نہ نماز صحیح ہو سکتی ہے اور نہ آپ کے اور کارہائے خیر۔

میں نے کسی مجلس میں عرض کیا کہ مثلاً آپ ایک مسجد بناتے ہیں، امام بارگاہ بناتے ہیں، دس ہزار روپے اس پر خرچ کرتے ہیں مثلاً پانچ سو روپیہ چوری کا مال ہے یا کسی کا غصب کیا ہوا ہے تو اس امام بارگاہ کا یا مسجد کا استعمال کرنا جائز ہوگا؟

آپ انصاف کریں۔ تو اگر امامؑ کا مال کھایا ہوا ہو تو وہ بھی وہی کیفیت ہے۔ اس سے آپ لباس لیں۔ اس کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ آپ مکان بنائیں تو اس کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ امام بارگاہ بنائیں تو کچھ کریں آپ۔

تو لہٰذا آپ اپنے آپ کو عادی بنائیے جن پر خمس واجب ہے وہ خمس دیں، جن پر زکوٰۃ واجب ہے وہ زکوٰۃ دیں۔ تو یہ روز روز کے چکر سے امام بارگاہ نہیں بنتا، مسجد نہیں بنتی۔ اور اسی لیے میں نے آپ حضرات کو تنگ کرنے کے لیے کراچی سے لے کر پشاور تک مختلف جگہوں پر مدارس بنانے شروع کیے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ چار پیسے کوئی دے دیتا ہے تو اُن پر جا کر لگا دیتے ہیں تو آپ میں کچھ لوگ ہیں ہمارا بھی کام ہوتا ہے، لیکن اگر آپ سب حضرات تہیہ کرلیں کہ ہمارا جا ہے جتنا بھی مالِ امامؑ نکلے گا تو وہ ہم دیں گے۔ تو پھر یہ کام جلد سے جلد ہوسکیں گے اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ چند علماء کے دنیا سے جانے سے کتنا بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ حافظ صاحب مرحوم کے بعد کافی سارا خلا ہوا۔ اس کے بعد ایک دو افراد اور بھی چلے گئے۔

اب بقول ایک مرجع تقلید کے کہ وہ کہتے تھے کہ ایک آدمی بھی پیدا ہوتا ہے اس کے لیے ہزاروں آدمیوں پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔

امام خمینیؒ جیسے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیدا نہیں ہوتے۔ آخر مدارسِ دینیہ کے ایک فرد ہیں۔ تو اب ایران میں تین لاکھ کے قریب طلبہ وعلماء ہیں۔ لہٰذا

اتنے بڑے بڑے مدرسے وہاں ایران میں بن رہے ہیں جو آپ کے تصور میں نہیں آسکتے۔ ہم نے روپیٹ کر، اس پورے پاکستان سے گدائی کر کے جامعۃ المنتظر کے کمرے جو کھڈیوں کی طرح ہیں وہ بمشکل دو اڑھائی سو طلبہ کے لیے بنائے اور وہ بھی لوگ کہتے ہیں کہ اتنا بڑا کس لیے بنالیا ہے؟

اب کراچی میں ایک مدرسہ بنارہے ہیں، روہڑی میں بنارہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ۲۰، ۲۵ جگہوں پر ہم نے بنیادیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ یہاں علماء کی کمی ہے، حتیٰ کہ پیش نماز بھی نہیں ملتے۔ جب تک ظاہر ہے کہ پبلک کا تعاون نہ ہو، اس وقت تک کوئی کام بھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔

اب میں نے ایک اشارہ کیا تھا کہ پہلے تو کوئی خمس دیتا نہیں ہے اور اگر وہ نکال لے تو وہ کہتا ہے کہ جی ہم ہسپتال بنالیں؟ بدبختو دین کے کام تو ہوتے نہیں، تمہیں ہسپتال کا بڑا شوق ہے۔ یہ مالِ امامؑ جو ہے اصل بنیاد تو اس کی دینی کام ہے۔ باقی جو ضروریات ہیں ان کی ضرورت بعد کی ہے۔ سب سے پہلے علمِ دین ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ مراجع تقلید سب سے پہلے مدارسِ دینی پر خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد امام بارگاہ ہیں، ان کی نگاہ میں بعد کی چیز ہے۔

اب مجھے ڈر بھی لگتا ہے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ امام بارگاہ بعد میں۔ تو میرے محترم کچھ پڑھے لکھے ہوں گے تو امام بارگاہ بھی آباد ہوں گے۔ کوئی پڑھا ہوگا تو مسجد بھی آباد ہوگی۔

تو میرے دوستو! ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ ہمارے اسلاف اور ہمارے بزرگ ہمیشہ اپنی علمی اور عملی کاوش کی بنا پر قوموں پر قیادت کرتے رہے ہیں۔ گذشتہ تاریخیں پڑھیں۔ جب بھی قومیں خصوصاً مسلمان قومیں جب کسی مصیبت

میں پھنسیں تو جب تک آئمہ اہلِ بیتؑ موجود تو ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور یا پھر ان کے بعد ان کے ماننے والوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔

تو اب ہم آہستہ آہستہ لاعلمی، بدعملی کی وجہ سے ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اب لوگ ہماری قیادتیں کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اتنا ہی اشارہ کافی ہوگا۔ قائداعظم شیعہ تھے جس نے یہ ملک بنایا تھا اور ساری دنیا کو انہوں نے اور سب مسلمان ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔

اب یہ مولوی جو زیادہ شور مچا رہے ہیں کہ یہ بل یوں ہونا چاہیے۔ یہ سب آپ کو پتہ ہے کہ کدھر تھے۔ لیکن ہم سب کو برداشت کرتے ہیں اور صرف اتنی بات کہتے ہیں کہ ہمیں بھی برداشت کرو اور اگر ایسا کرو گے تو یقیناً اس ملک میں نظامِ اسلام قائم ہوگا۔ ذرا ہمارا ساتھ دو، ہمیں برداشت کرو، پھر دیکھو یہاں اسلام آتا ہے یا نہیں آتا۔ اور ہمارے پاس تو مثالیں موجود ہیں کہ جس دن سے کنٹرول سنبھالا اسی دن سے نظامِ اسلام رائج ہوگیا تو یہاں کیا ہوگیا ہے کیوں اٹکا ہوا ہے؟

تو دوستو ____ !

ایک تو شیعہ قوم سے مجھے اپیل ہے کہ وہ تعلیم میں اپنے مدرسے بنائیں اور اپنے کالج بنائیں اور نادار بچوں کو تعلیم کی سہولت مہیا کریں اس لیے کہ تعلیم سے ہی دنیا نے ترقی کی ہے اور پھر دوسری منزل آجاتی ہے عمل کی، لیکن صرف تعلیم برائے تعلیم نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کل کو پروفیسر بنیں تو مسلمان پروفیسر بنیں۔ کالجوں اور اسکولوں میں کیوں طالب علموں کی تربیت نہیں ہوتی۔ طالب علم دین دار کیوں نہیں بنتے؟ اس لیے کہ جو ان کے استاد وہ بھی ویسے ہی ہیں۔ اگر وہ دین دار ہوں، تربیت یافتہ ہوں تو وہ بھی دین دار بنیں گے۔

تو تعلیم صرف کافی نہیں ہے بلکہ تعلیم کے لیے تربیت کی بھی ضرورت ہے۔
اب یہ کوئی ڈھکی چھپی ہوئی بات ہے کہ (کیا کوئی امامؑ ایسا تھا) جو ڈاڑھی منڈواتا تھا؟ تو اب ہم ان کے ماننے والے ہیں تو کیوں؟ وہ تو ان کے دشمن یہ کام کرتے تھے لہٰذا ہمارا کردار ان کے عمل کے مطابق ہونا چاہیے۔ کوئی امامؑ تھا کہ جس کی کوئی نماز چھوٹی ہو؟ کوئی امامؑ تھا کہ جس کا کوئی روزہ چھوٹا ہو؟

ہم تو ان کو مانتے ہیں کہ جو معصومؑ ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم معصوم تو نہیں بن سکتے مگر کوشش تو کریں ان کی اتباع کرنے کی۔ اور اب یہ کہا جاتا ہے کہ جی وہ تو معصومؑ تھے ہم کوئی معصوم ہیں؟

ٹھیک ہے وہ معصومؑ تھے لیکن سلمان فارسیؓ تو معصوم نہیں تھے، ابوذر غفاریؓ تو معصوم نہیں تھے، مقدادؓ ابن اسود تو معصوم نہیں تھے، عمار یاسرؓ تو معصوم نہیں تھے اور حسینؑ کے علاوہ بہتر تو معصوم نہیں تھے۔ یہ سب غیر معصوم ہی تھے لیکن یہ غیر معصوم معصوم کے نقشِ قدم پر اتنے ڈھلے ہوئے تھے کہ ان کے اور معصومؑ کے عمل میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

ذکرِ مصائب: شہادتِ جناب علی اصغرؑ

دوستو! جب حسینؑ اپنی ساری قربانیاں دے چکے اور آپؑ نے استغاثہ کیا:

هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا

هَلْ مِنْ مُغِيْثٍ يُغِيْثُنَا

””کیا کوئی ہماری مدد کرنے والا ہے، کیا کوئی ہماری فریاد رسی کرنے والا ہے“۔

جو اکبرؑ کو برچھی مار چکے تھے، جو عباسؑ کے بازو قلم کر چکے تھے، جو عونؑ و محمدؑ کو شہید کر چکے تھے، ان سے تو توقع نہیں تھی البتہ جب حسینؑ نے یہ آواز بلند کی اب خیمے میں ایک تو بیمار تھا اور ایک چھ ماہ کا بچہ تھا۔ بچہ اور تو کچھ نہیں کرسکتا تھا اس نے اپنے آپ کو جھولے سے گرا دیا۔ اس کا جھولے سے گرنا تھا کہ بیبیوں کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ امام مظلومؑ خیمے میں پلٹ کر آئے، پوچھا کہ بہن کیا بات ہے؟ بیبیاں کیوں رو رہی ہیں؟

تو عرض کیا کہ بھائی جان جب سے آپ نے هَلْ مِنْ نَاصِرٍ......الخ کی آواز بلند کی ہے تو اصغرؑ نے اپنے آپ کو جھولے سے گرا دیا ہے۔

فرمایا: اچھا میرے بیٹے کو میرے پاس لے آؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو پانی پلا لاؤں۔

حسینؑ اپنے چھ ماہ کے بچے کو لے کر میدان میں آئے اور ارشاد فرمایا: اے مسلمانو!

اِنْ لَمْ تَرْحَمُوْنِی فَارْحَمُوْا هٰذَا

"اگر مجھ پر رحم نہیں آتا تو کم از کم اس چھ ماہ کے بچے پر تو رحم کرو"۔

پھر جب حسینؑ نے بچے کو اپنے ہاتھوں پر لے کر بلند کیا تو میں نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا کہ اکبرؑ نے ساری فوج کے رُخ موڑ دیے ہوں۔ عباسؑ نے پوری فوج کے رُخ کو موڑ دیا ہو۔ لیکن اس چھ ماہ کے بچے کی مظلومیت ایسی تھی کہ پوری فوج کے رُخ مڑ گئے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ حالت دیکھی جب عمر ابن سعد نے تو دوڑ کر حرملہ کے پاس آیا، آ کر کہا اے حرملہ! کیا دیکھ رہے ہو؟

اِقْطَعْ کَلَامَ الْحُسَیْنِ

''حسینؑ کی کلام کو قطع کرو''۔

عزادارو ___!

اب حرملہ نے تیر کمان میں جوڑا۔ میں جس زمانے میں عراق میں تھا وہاں میں نے سنا کہ کچھ لوگ جیسے آپ شبیہیں بناتے ہیں وہ بھی ایک مصنوعی بچہ کی شبیہ بناتے تھے اور کسی سے کہتے کہ تم اس بچے کے گلے پر تیر مارو۔ سچ مچ کا وہ بچہ نہیں ہوتا تھا بلکہ مصنوعی بنایا ہوا ہوتا تھا۔

اب جس سے کہتے تھے وہ تیار نہیں ہوتا تھا تو کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی جس کو واقعہ کربلا سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا اس کو دکھایا کہ یہ بچہ نہیں ہے صرف بچے کی تصویر ہے اگر اس کو تیر مارو تو تمہیں انعام دیں گے۔ تمہاری کچھ خدمت کریں گے۔ اس نے دیکھا کہ واقعاً یہ بچہ نہیں ہے، مصنوعی بچہ ہے۔ تیر و کمان اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور اس نے بچہ کے یعنی اس مصنوعی بچے کا نشانہ لے کر تیر چلانے لگا تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ پھر اس نے کوشش کی تو پھر اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ تیسری مرتبہ جب اس نے کوشش کی تو تیر و کمان پھینک دیا اور کہنے لگا کہ مجھے تمہارے انعام کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ یہ بچہ نہیں ہے لیکن اس بچے کی تصویر کو بھی میرا دل نہیں مانتا کہ میں تیر ماروں۔ اب

عزادارو ___!

آپ غور کریں کہ کربلا کے میدان میں وہ ظالم کتنے سنگ دل تھے، وہ حرملہ کتنا سنگ دل تھا کہ جس کو عمر ابن سعد نے کہا کہ

اِقْطَعْ کَلَامَ الْحُسَیْنِ ''حسینؑ کی کلام کو قطع کرو''۔

اب اس نے تیر مارا۔

عزادارو......!

جب تیر مارا جاتا ہے نشانے پر تو دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا یا تیر وکمان مضبوط ہوتا ہے اور نشانہ کمزور ہوتا ہے اور یا نشانہ مضبوط ہوتا ہے اور تیر وکمان کمزور ہوتا ہے۔ اگر نشانہ مضبوط ہو اور تیر مارا جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ ہل جاتا ہے لیکن اگر تیر وکمان مضبوط ہو اور نشانہ کمزور ہو تو پھر نشانہ اُلٹ جاتا ہے۔

اب ذرا تصور کریں!

کہ کربلا میں حسینؑ کے ہاتھوں پر ایک چھ ماہ کا بچہ ہے۔ تین دن کا بھوکا اور پیاسا بھی ہے۔ اس کی ماں کا دودھ بھی خشک ہو چکا ہے اور اس کو تیر مارنے والا ایک مشہور پہلوان جس کی کلائیاں مضبوط ہیں اور تیر وکمان کسا ہوا ہے۔ تو جب اس لعین نے تیر چلایا تو تاریخ کے الفاظ ہیں کہ بچہ تڑپ کے اُلٹ گیا، حسینؑ کے ہاتھوں پر۔

عزادارو......!

جب اصغرؑ پانی پی چکا تو اب حسینؑ جو ربابؑ سے لے کر آئے تھے کہ تیرے بچے کو پانی پلا آؤں اور جب اصغرؑ پانی پی چکا تو دسویں کے دن آپ ایک عمل کرتے ہیں۔ سات مرتبہ آگے جاتے ہیں اور سات مرتبہ پیچھے جاتے ہیں۔ کبھی غور کیا کہ یہ عمل کیوں کیا جاتا ہے؟

ہوا یہ تھا کہ جب اصغرؑ پانی پی چکے تو حسینؑ خیمے کی طرف جاتے تھے تو خیال آتا تھا کہ ربابؑ دروازے پر کھڑی ہوگی، پھر پلٹ آتے تھے، پھر جاتے تھے، پھر پلٹ آتے تھے۔ آخر حسینؑ گئے کہ یہ فاطمہ زہراؑ کی بہو ہے یقیناً

برداشت کرلے گی اس مصیبت کو۔ لہٰذا جب ماں کے ہاتھ پہ اصغرؑ کو دیا اور جناب ربابؑ نے دیکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ تیر سے سوراخ ہوجاتا ہے۔ ذبح چھری سے کیا جاتا ہے لیکن تاریخ کے لفظ یہ ہیں جب اس لعین نے تیر مارا تو تیر نے اس بچے کو ایک کان سے دوسرے کان تک ذبح کردیا۔ یعنی بچے کا گلا اتنا نازک تھا اور تیر اتنا سخت تھا کہ وہ تیر چھری کا کام کرگیا۔

تو اب ماں نے جب دیکھا تو ایک نگاہ کی اس بچے پر اور حسرت بھری نگاہ سے جناب ربابؑ نے کہا کہ میرے بیٹے

اَمِثْلُكَ تُنْحَرُ

''کیا تیرے جیسے بچے بھی نحر کیے جاتے ہیں؟''

عزادارو۔۔۔!

جب حسینؑ آخری قربانی دے چکے اور اس کو دفن کر چکے تو خیمے میں آئے۔ سب سے پہلے اس خیمے میں جہاں سید سجادؑ بستر بیماری پر تھے، آتا ہوا دیکھ کر جناب زینبؑ نے کندھا ہلایا بیمار کربلا کا۔ بیٹا اٹھو! بابا الوداع کے لیے آرہے ہیں۔ سید سجادؑ کی ایک خاص کیفیت تھی اگر وہ کیفیت نہ ہوتی تو ان پر جہاد واجب ہوجاتا۔

لہٰذا ظاہراً جو کچھ ہورہا تھا وہ ان کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حسینؑ آئے اور دیکھا کہ سر سے لے کر پاؤں تک زخمی ہیں۔ تو پہلا سوال یہی کیا کہ بابا اکبرؑ کہاں ہے؟

فرمایا: بیٹا شہید ہوگیا ہے۔

پھر سوال کیا کہ چچا عباسؑ کہاں ہیں؟

فرمایا: شہید ہو گئے۔

ایک ایک کا نام پوچھتے ہیں۔ حسینؑ نے فرمایا: کب تک پوچھو گے تمہارے اور میرے علاوہ باقی کوئی نہیں رہ گیا۔ اور میں بھی اجازت لینے آیا ہوں۔ مجھے اجازت دو اور تم جانو اور تمہاری پھوپھیاں جانیں۔ امامت کی وصیتیں کیں، سید سجادؑ سے وداع کیا۔ خیمے کے صحن میں آئے تو بیبیاں جمع ہو گئیں۔ اب آخری قربانی جارہی ہے۔ اب بیبیوں کا کیا عالم ہے۔ اس کی ظاہر ہے کہ الفاظ تصویر کشی نہیں کر سکتے۔

ایک ایک بی بی سے الوداع کیا اور حسینؑ نے ایک ایک بی بی کا نام لے کر سلام کیا۔

اے اُم کلثومؑ! اے ربابؑ! اے لیلیٰ، اے سکینہؑ، اے فاطمہؑ، اے فضہؑ

عَلَيْكُنَّ مِنِّي سَلَامٌ

"حسینؑ کا آخری سلام قبول کرو"۔

جب حسینؑ سلام کر کے خیمے سے نکلنے لگے تو زینبؑ نے دامن تھام لیا۔

حسینؑ نے پوچھا: کیا بات ہے، بہن؟

عرض کرتی ہیں کہ اے بھائی! تھوڑی دیر تو رُک جاؤ۔ بہن آپ کے چہرے کی تو زیارت کر لے۔ بڑی مشکل سے حسینؑ نے اجازت لی۔ خیمے سے باہر نکلے، اب حسینؑ گھوڑے پر سوار ہونے لگے۔ یہ وہی حسینؑ ہیں کہ پہلے جب سوار ہوتے تھے تو کسی طرف سے اکبرؑ آجاتا تھا، کسی طرف سے عباسؑ آجاتے تھے، کوئی گھوڑے کی لگام پکڑتا تھا۔ کوئی حسینؑ کو سوار کرتا تھا۔ اس زمانے میں نہ حسینؑ زخمی ہوتے تھے، نہ تھکے ہوتے تھے، نہ پیاسے ہوتے تھے۔ آج حسینؑ زخمی

بھی ہیں، صبح سے لے کر عصر تک لاشیں اُٹھا اُٹھا کر تھک بھی گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ ہیں تاریخ کہ

فَنَظَرَ یَمِیْنًا وَ شِمَالًا

حسینؑ نے دائیں بائیں دیکھا اور کہا کہ اے عباسؑ! اے اکبرؑ! اے عونؑ و محمدؑ، اے حبیبؓ ابن مظاہر، اے میرے شیرو! اے میرے بہادرو!

ارے حسینؑ تمہیں پکار رہا ہے جواب کیوں نہیں دیتے؟

سنتا ہوں کہ زینبؑ آگے بڑھیں، بھائی کو سوار کیا، جب حسینؑ گھوڑے پہ سوار ہو چکے تو اب آپ نے لگام اُٹھائی لیکن گھوڑا آگے نہیں چلتا۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تو تین دن کا بھوکا اور پیاسا ہے لیکن یہ میری آخری سواری ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی میں تمہاری پشت پر سوار نہیں ہوں گا۔ ایک دفعہ مجھے میدان میں لے جاؤ۔

اولاد والو!

گھوڑے نے اپنا منہ اپنے پاؤں کی طرف کیا۔ حسینؑ دیکھتے ہیں کہ ایک تین سال کی بچی ہے جو گھوڑے کے سموں کے ساتھ لپٹی ہوئی ہے اور کہہ رہی ہے کہ میرے بابا کے گھوڑے جو میدان میں گیا وہ پلٹ کر واپس نہیں آیا۔ میرے بابا کو میدان میں نہ لے جاؤ۔

عزادارو ــــــ!

دکھی حسینؑ بڑی مشکل سے سوار ہوئے تھے۔ اُتر آئے، بچی کو اُٹھایا، سینے سے لگایا، پیار کیا، کہا بیٹا! اجازت دو۔

بچی ایک سوال کرتی ہے کہ بابا کیا آپ مرنے کے لیے تیار ہو گئے؟

تو آپ کے مظلوم امامؑ کہتے ہیں: اے سکینہؑ! جس کا کوئی نہ رہ گیا ہو تو وہ موت کے لیے کیوں نہ تیار ہو۔ تو بچی کہتی ہے بابا! پھر ہمیں تو بابا کے روضہ پر پہنچا دو۔

فرمایا: بیٹی اگر یہ مسلمان مجھے مہلت دیتے تو میں زہراؑ کی بیٹیوں کو جنگلوں میں کیوں لے آتا؟

بس عزادارو ــــــ !

حسینؑ میدان میں گئے، خطبے پڑھے۔ اتمامِ حجت کیا، جنگ کی اور مسلمانوں نے آخری مہمانی دی؟ کیسے مہمانی دی؟ تاریخ کے لفظ ہیں کہ لوگ چار حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ وہ تھے کہ جن کے ہاتھوں میں نیزے تھے، کچھ وہ تھے کہ جن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں، کچھ وہ تھے کہ جن کے ہاتھوں میں تیر تھے اور جن کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا انہوں نے کربلا کی گرم زمین سے پتھر اور ان سے اس طریقے سے پھولوں کی بارش کی کہ اب حسینؑ گھوڑے کی زین پر ٹھہر نہ سکے۔ گھوڑے کی زین سے زمین پر آئے۔ میں نے غلط کہا کہ حسینؑ زمین پر آئے۔ آپؑ کے امامِ زمانہ عجل اللہ فرجہ الشریف فرماتے ہیں:

"سلام ہو اس مظلوم پر کہ جس کی لاش کو تیروں نے اٹھایا ہوا تھا"۔

بس عزادارو ــــــ !

گھوڑے کو اشارہ کیا کہ میرا آخری وقت ہے اور بیبیاں سب خیمے کے دروازے پر جمع ہوں گی۔ ان کو جا کر بتا دو کہ اب حسینؑ پلٹ کر واپس نہیں آئیں گے۔

عزادارو.....!

گھوڑے نے حسینؑ کے گرد چکر لگایا۔ اپنی پیشانی کو خون حسینؑ سے تر کیا۔ جب تر کر چکا تو ہنہناتا ہوا خیام کی طرف بڑھا۔ گھوڑا کا بڑھنا تھا کہ بیبیوں نے سمجھا کہ حسینؑ پھر الوداع کے لیے آرہے ہیں لیکن اچانک بیبیاں جب دروازے پر آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ رہوار تو آیا لیکن سوار نہ آسکا۔

واہ محمداہ، واہ علیاہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔

●......●......●

مجلس نہم

- یقیناً دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔
- جیسے جیسے طالب علموں کی استعداد بڑھتی گئی ویسے کورس بھی بدلتا رہا۔
- میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ میں تکمیل کروں اچھے اخلاق کی اور بہترین کردار کی۔
- ان کے نفسوں کو پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔
- جو رسول تھے وہ ان صاحبانِ شریعت کے مبلّغ تھے اور محافظ بھی تھے۔
- پیغمبرؐ اسلام نے محافظین اسلام کا جہاں جہاں کہیں موقع ملا، بار بار تعارف کرایا۔
- آج کے بعد اپنے بیٹے کی بات کو سنتا بھی اور اس کی اطاعت بھی کرتا۔
- کیا اشرفِ کائنات افضلِ کائنات رسولؐ اس معاہدے پر برقرار نہ رہے؟
- کیا میں ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاؤں؟
- اگر کوئی جوان ہے تو علیؑ ہے اگر تلوار ہے تو ذوالفقار ہے۔

ذکرِ مصائب: قافلۂ حسینیؑ شہر بہ شہر

- کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، فرشتہ نہیں آیا، یہ تو بنوہاشم کا ڈھونگ تھا۔
- بیبیاں قید ہو کر درباروں اور بازاروں میں جا سکتی ہیں لیکن حسینؑ ناناؐ کے دین کو مٹنے نہیں دے گا۔

مجلسِ نہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (سورہ آل عمران، آیہ ۱۹)

دوستو اور بزرگو!

ارشادِ رب العزت ہے کہ "یقیناً دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے"۔

یعنی بایں معنی کہ دین اللہ کے نزدیک اسلام تھا، ہے اور رہے گا۔ اللہ کا دین ایک ہے اور دین گویا ایک درس گاہ ہے کہ جس درس گاہ کی نرسری حضرت آدمؑ سے شروع ہوئی اور پہلے صاحب شریعت رسول حضرت نوحؑ ہیں یعنی نرسری میں تو کوئی کتاب ہی نہیں ہوتی، وہاں تو استاد ہوتا ہے۔ گویا ابتدائی بچے ہوتے ہیں جن کو کچھ تصویریں دکھائی جاتی ہیں اور ان کے نام بتائے جاتے ہیں اور یہی کام اس وقت ہوا تھا۔ وہ واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ میں پہلے بھی ایک مجلس میں اشارہ کر چکا ہوں۔

اس کے بعد گویا حضرت نوحؑ کے زمانہ میں اس کی ترقی ہوئی۔ اب کچھ صحیفے، صحیفے کے معنی چھوٹے چھوٹے کتابچے آنے لگے تو جب معاملہ حضرت ابراہیمؑ تک پہنچا تو پھر اور اس کو ترقی ہوئی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں تو

باقاعدہ ایک کتاب نازل ہوئی جسے توراۃ کہتے ہیں اور پھر زبور جو ہے وہ کوئی احکام کی کتاب نہیں ہے۔ وہ تو ایک دعاؤں کا مجموعہ ہے جیسے کہ ہمارے ہاں صحیفہ سجادیہ ہے۔ تقریباً جس میں دعائیں ہی دعائیں ہیں۔ اسی طریقہ سے زبور میں بھی دعائیں ہی دعائیں ہیں، احکام نہیں ہیں۔ پھر اس کے بعد انجیل آئی۔ جتنے جتنے طالب علموں کی استعداد بڑھتی گئی اتنا کورس بھی بدلتا رہا اور استاد بھی بدلتے رہے۔ پھر آخر میں تو ظاہر ہے کہ پھر وہ کورس بھی مختصر ہوتا تھا اور تعلیم بھی مختصر ہوتی تھی اور احکام بھی مختصر ہوتے تھے۔ آخر میں سرکار رسالتؐ تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ

"فرمایا میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ میں تکمیل کروں اچھے اخلاق کی اور بہترین کردار کی"۔

تو سرکار رسالتؐ تکمیل کے لیے آئے تھے، یعنی کام پہلے سے شروع ہے۔ اب اس کام کو آخری شکل دینا ہے۔ جو کچھ نازل ہونا تھا وہ پیغمبرؐ اسلام پر نازل ہو چکا۔ تا قیامِ قیامت جن جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی تھی وہ سب احکام قرآن میں آگئے اور ان کی تفصیل سرکار رسالت کو معلوم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کہتا ہے کہ ہم نے ایسا رسولؐ بھیجا کہ جو آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفسوں کو پاک کرتا ہے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

لہٰذا جب آپ سب احکام پہنچا چکے تو ارشاد قدرت ہوا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ○ (سورۂ مائدہ، آیہ ۳)

""آج دین مکمل ہو گیا، نعمت تمام ہو گئی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو ہمیشہ کے لیے پسند کرلیا"۔

اب ایک سلسلہ تھا جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوا اور حضرت عیسٰیؑ تک آیا۔ اب اس میں صاحبانِ شریعت جو رسول تھے وہ جناب نوحؑ ہیں۔ ان کے بعد جناب ابراہیمؑ ہیں، ان کے بعد جناب موسٰیؑ ہیں اور ان کے بعد جناب عیسٰیؑ ہیں اور ان انبیاء کے درمیان ان کے اوصیاء اور نبی جن کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار آئی۔ تو جو نبی ایک شریعت لے آتا تھا تو پھر ہزاروں کی تعداد میں اس کے محافظ ہوتے تھے۔

توجہ چاہوں گا ــــــ!

نبی تو چار تھے نا صاحب شریعت پہلے، باقی جو رسول تھے وہ اِن صاحبانِ شریعت کی شریعت کے مبلغ تھے اور محافظ بھی تھے۔

ٹھیک ہے نا ــــــ!

جب کہ یہ وقتی تھے۔ پہلے شریعت کے بعد دوسری شریعت آئی تو کچھ احکام رکھے اور کچھ احکام کو منسوخ کر دیا گیا۔ کسی نبی نے یہ نہیں کہا کہ میں جو چیز لے کر آیا ہوں یہ آخری چیز ہے۔

تو سرکار رسالتؐ سے پہلے جتنا نظام آیا اگرچہ وہ اپنی جگہ پر مکمل تھا لیکن آئندہ کے طور پر وہ ناقص تھا۔ جیسے مثلاً پرائمری تک جو نصاب ہے، پرائمری کے طالب علموں کے لیے وہ مکمل ہے۔ لیکن اگلی کلاسوں کے طلبہ کے لیے تو وہ غیر مکمل ہے۔ اس طریقے سے میٹرک کا جو نصاب ہے وہ میٹرک کے طلبہ کے لیے مکمل ہوسکتا ہے۔ لیکن اُوپر کے طلبہ کے لیے وہ ناقص ہے۔ تو اسی طرح جتنے نصاب

آئے تو وہ اپنے مقام پر تو مکمل تھے لیکن آئندہ کے لیے وہ ناقص تھے۔ تو اب بڑی عجیب بات ہے۔

توجہ چاہوں گا ____!

کہ وہ پروگرام جو وقتی تھے ان کی ترویج کے لیے، ان کی تبلیغ کے لیے، ان کی حفاظت کے لیے تو ہزاروں افراد آئے اور وہ نظام جس نے تا قیامِ قیامت رہنا تھا کیا اس کا خدا نے اور اس کے رسولؐ نے کوئی انتظام کیا یا نہیں کیا۔ اور اگر نہیں کیا تو یہ بات عقل میں آنے کی نہیں ہے کہ جو پروگرام وقتی تھے اس کے لیے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار بھیجے گئے اور جو پروگرام تا قیامِ قیامت تھا اس کے لیے کہا گیا کہ استاد بھی خود معین کر لینا اور نصاب بھی خود معین کر لینا۔ ایسا نہیں ہو سکا بلکہ ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ کسی پروگرام کو پیش کرنا اتنا مشکل نہیں ہے، جتنا کہ اس کو برقرار رکھنا مشکل ہے۔

تو پیغمبرِ اسلام نے ۲۳ سال میں ایک پروگرام پیش کیا اور وہ پروگرام رہنا بھی تا قیامِ قیامت تک ہے۔ تو اگر اس کی بقا کا انتظام پیغمبرؐ نہیں کر گئے۔ اگر فرض کریں کہ نہیں کر گئے، کیا یہ اقدام عقل کی بارگاہ میں قابلِ قبول ہوگا؟

جب کہ جو کام وقتی تھے ان کی حفاظت کے لیے تو ہزاروں آدمی یکے بعد دیگرے رسول آئے، نبی آئے، وصی آئے لیکن جو تا قیامِ قیامت رہنا ہے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ گویا طالب علموں کو کہہ دیا گیا تم استاد بھی خود معین کر لینا اور نصاب بھی خود معین کر لینا۔ کیا آج تک دنیا میں کبھی ایسا ہوا؟ جب نہیں ہوا تو پھر ماننا پڑے گا کہ جیسے قرآن کہتا ہے کہ

"اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں انوکھا رسول نہیں ہوں

میرا طریقہ وہی ہے جو گذشتہ انبیاء کا تھا"۔

جس طریقے سے وہ انبیاء اپنے دین کے محافظ مقرر کر کے خدا کے حکم سے ان کا اعلان کیا کرتے تھے اسی طریقے سے ماننا پڑے گا کہ پیغمبرؐ نے بھی اپنے دین کے تاقیامِ قیامت تک کے لیے محافظ مقرر کیے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو پیغمبرؐ اسلام نے محافظین اسلام کا جہاں جہاں کہیں موقع ملا، بار بار تعارف کرایا اور جتنا ان محافظوں کا تعارف کرایا اتنا کسی چیز کا نہیں کرایا۔ اور ہونا بھی ایسا چاہیے کیونکہ یہ دین تاقیامِ قیامت تک باقی رہتا ہے۔ تو اس کے محافظ بھی تاقیامِ قیامت ہونے چاہئیں۔ اس لیے پیغمبرؐ اسلام نے اپنی مشہور حدیث میں جو متفق بین الفریقین ہے، بنیادی طور پر۔ ارشاد فرمایا کہ میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور ایک میرے اہل بیتؑ۔ اور یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ کوثر کے کنارے میرے پاس پہنچیں۔ یعنی ان کا ساتھ صرف دنیا تک نہیں ہے بلکہ قیامت تک ہے۔

اب ہر منزل پر جہاں پیغمبرِ اکرمؐ کو موقع ملا، ان کا تعارف کرایا، سب سے پہلا جلسہ جو اعلانِ رسالتؐ کے بعد ہوا۔ اس جلسہ کو دعوت ذوالعشیرہ کہتے ہیں۔ یہ وہ پہلا جلسہ ہے جو پیغمبرؐ نے منعقد کیا۔ جس کو تمام مورخین، مفسرین، محدثین، مسلمانوں اور غیر مسلمانوں نے تسلیم کیا۔ سب نے کہا ہے کہ اس جلسہ میں صرف بنی ہاشم شامل ہوئے اور وہ کم و بیش چالیس افراد تھے کہ جن میں سے سارے مسلمان بھی نہیں تھے۔ تو پہلی بات تو یہ سوچنے کی ہے کہ حالانکہ تین سال کے عرصہ میں کافی لوگ مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے۔

تو اب جلسہ کرنا ہے تو ان کو جمع کیا جائے جو مسلمان ہوئے لیکن پیغمبرؐ نے انھیں جمع نہیں کیا بلکہ خاندان بنی ہاشم کو جمع کیا جن میں سے بعض غیر مسلمان تھے۔ بڑی قابلِ غور بات ہے تو گویا اس کا معنی یہ ہے کہ جو کارروائی اس جلسہ میں ہونے والی ہے اس کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ اس کا تعلق دوسرے کسی کے ساتھ نہیں ہے تو ان کو جمع کیا اور ایک دن دعوت کی، کہ وہاں مختصر سا کھانا تھا لیکن سرکار رسالتؐ کی نگاہ کرم کی برکت سے اس تھوڑے سے کھانے سے چالیس آدمی سیر ہو گئے، آپ اُٹھے اور کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ابولہب نے درمیان میں یہ کہہ دیا کہ یہ تو جادوگر ہے۔ تو آپ نے مناسب نہ سمجھا گفتگو کرنا، لہٰذا دوسرے دن پھر پروگرام کیا۔

اب دوسرے دن اتفاق کی بات ہے کہ وہ نہیں بولا، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے پاس وہ لے کر آیا ہوں کہ جس سے بہتر کوئی شخص اپنی قوم کے لیے لے کر نہیں آیا۔ میں دنیا اور آخرت کی سعادت لے کر آیا ہوں۔ اور وہ سعادتِ دنیا اور آخرت دو کلمے ہیں جو کہنے میں آسان ہیں لیکن وزن بہت رکھتے ہیں۔ وہ کیا کہ اللہ کو ایک مانو اور محمدؐ کو اس کا رسول مانو۔

یہ ارشاد کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس مشن میں یعنی اللہ کو اللہ منوانے اور پیغمبرؐ کی رسالت کا پرچار کرنے میں جو شخص میرا ساتھ دے، میری مدد کرے، میرے ساتھ تعاون کرے تو وہ میرا وصی ہوگا۔ میرا وزیر ہوگا اور میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا۔ یہ اعلان کیا پیغمبرؐ نے۔ گویا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بعد پیغمبرؐ کی نگاہ میں سب سے اہم چیز لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ (صلوٰۃ)

تو اب وہ مجمع تو خاموش ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ یہ سمجھتے تھے کہ اگر

مجھے دین کا محافظ ملتا ہے تو اسی مجمع میں ملتا ہے۔ اس سے باہر نہیں ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے۔ تو اب اس مجمع نے تو خاموشی اختیار کی البتہ ایک تیرہ سال کا بچہ کھڑا ہو گیا اور وہ کہتا ہے کہ یارسولؐ اللہ! میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ میں آپ کی مدد کروں گا۔ آپؐ کہتے ہیں بیٹھ جاؤ۔ علیؑ بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر حضورؐ اعلان کرتے ہیں کہ جو شخص میرا ساتھ دے گا، میرے ساتھ تعاون کرے گا وہ میرا وصی ہوگا، میرا وزیر ہوگا اور میرے بعد میرا خلیفہ ہوگا۔ پھر کوئی جواب نہیں دیتا اور وہی بچہ کھڑا ہو جاتا ہے۔

اگر آپ تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں تو اس قسم کے کئی موارد آتے ہیں کہ علیؑ اُٹھتے ہیں اور رسول کہتے ہیں: بیٹھ جاؤ، کیوں؟ تاکہ کل دنیا یہ نہ کہے کہ کسی اور کو تو موقع ہی نہیں دیا گیا لہٰذا بار بار پیغمبرؐ موقع ضرور فراہم کرتے تھے۔

اب جب کسی نے جواب نہیں دیا تو ظاہراً معاہدہ مکمل ہو گیا۔ رسولؐ نے کہا کہ جو ساتھ دے تو اس کے تین منصب ہیں کہ وصی بھی ہے، وزیر بھی ہے، خلیفہ بھی ہے۔ علیؑ کہتے ہیں کہ میں ساتھ دوں گا تو اب معاہدہ مکمل ہو جانا چاہیے۔ لیکن اس کو کافی نہیں سمجھا۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کو آگے بلایا، ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، مجمع کی طرف اشارہ کیا!..کہا کہ "یہ میرا وصی بھی ہے، وزیر بھی ہے اور خلیفہ بھی ہے"۔

گویا پیغمبرؐ کو اس بچے پر اتنا اعتماد ہے کہ جو بچپن میں وہ وعدہ کر رہا ہے جس وعدہ پر وہ پورا اُترے گا۔ (نعرۂ حیدری)

یہ اعلان ہو گیا اور جب پیغمبرؐ یہ اعلان کر چکے، تو مجمع میں جو لوگ مسلمان نہیں تھے۔ انہوں نے جناب ابوطالبؑ سے کہا کہ اے ابوطالبؑ! آپ نے سنا؟ کہ آپ کا بھتیجا آپ کو کیا کہہ رہا ہے کہ آج کے بعد اپنے بیٹے کی بات کو سننا بھی

اور اس کی اطاعت بھی کرنا۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اہلِ زبان تھے۔ ان کے سامنے یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آج سے علیؑ رسولؐ کے خلیفہ ہو گئے۔ تبھی تو وہ کہہ رہے ہیں کہ اپنے بیٹے کی اطاعت کرنا اور بات سننا اور ابو طالبؑ خاموش ہیں۔ اور یہ نہیں کہتے کہ یہ اب کی بات تھوڑی ہے یہ تو رسولؐ کے بعد کی ہے۔

اُن کا خاموش رہنا اور ان کا طنز کرنا، اس کا معنی یہ ہے کہ یہ معاہدہ پکا ہو گیا اور آج سے یہ منصب علیؑ کے سپرد ہو گیا۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ علیؑ اپنے معاہدے سے پھر جائیں۔ تو پھر سرکارِ رسالتؐ کو بھی حق پہنچتا ہے کہ وہ اس معاہدہ کو لغو قرار دے۔

میرے دوستو ــــــ!

اس واقعہ کو جا کر تاریخ کی کتابوں میں پڑھیے اور غور کیجیے۔ یہ پہلا معاہدہ ہے جو سرکارِ رسالتؐ کسی سے کر رہے ہیں۔ اعلانِ رسالتؐ کے بعد پہلا معاہدہ ہو رہا ہے اب اگر وہ تیرہ سال کا بچہ اپنے معاہدے پر پکا رہتا ہے تو کیا کوئی مسلمان تصور کر سکتا ہے کہ تیرہ سال کے بچے نے تو معاہدہ نبھایا لیکن اشرف کائنات، افضل کائنات وہ رسولؐ اس معاہدے پر برقرار نہ رہے؟ تو لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جب تاریخیں متفق ہیں اس بات پر کہ معاہدہ پکا ہے تو پھر تصور بھی کوئی کلمہ گو نہیں کر سکتا کہ صادق الوعد اور امین رسولؐ اپنے معاہدے پر برقرار نہ رہے۔

اب تاریخ دیکھیں ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا واقعہ مل جائے کہ رسولؐ نے علیؑ کو مدد کے لیے پکارا ہو اور علیؑ نہ آئے ہوں۔ تو گنجائش مل جائے کہ یہ معاہدہ فسخ ہو جائے۔ لیکن ہم نے تو یہی دیکھا کہ اگر شعب ابی طالبؑ میں محمدؐ کے بستر پر اگر

کسی کے سونے کی ضرورت ہے تو علیؑ سو گئے ہیں اور شب ہجرت میں پیغمبرِ اسلام علیؑ کو کہتے ہیں کہ اے علیؑ! مجھے حکم ہے کہ میں آج رات یہاں سے چلا جاؤں۔ کافر مجھے قتل کرنے کے لیے منصوبہ بنا چکے ہیں لہٰذا آپ میرے بستر پر سو جائیں۔

اب علیؑ یہ نہیں پوچھتے کہ یارسولؐ اللہ! میں ابھی تو جوان ہوں تو یہ تو بتایئے کہ میری جان بھی بچ جائے گی کہ نہیں۔ یہ نہیں کہتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ کیا آپ کی جان بچ جائے گی۔ یعنی میں جو جان دوں تو اس کی کوئی قیمت تو ہونی چاہیے۔ تو آپ کی جان بچ جائے گی۔ فرمایا کہ ہاں میری جان بچ جائے گی۔ تو تاریخ یہی کہتی ہے کہ علیؑ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ یہ پہلا سجدۂ شکر تھا جو اسلام میں علیؑ کی جبین سے ہوا۔ (نعرۂ حیدری)

اب علیؑ پیغمبرؐ کی چادر لپیٹ کر سوئے اور ساری رات تلواروں کے سائے میں سو گئے۔ اس کے بعد جب مکہ میں آئے تو پہلی جنگ ہوئی تو اس پہلی جنگ میں وہ علیؑ کہ جس نے پہلے کبھی تلوار نہیں اٹھائی تھی۔

تاریخ یہی بتاتی ہے کہ تین سو تیرہ مسلمان اور تین ہزار فرشتے ان سب نے مل کر آدھے کفار قتل کیے۔ تنہا علیؑ نے آدھے قتل کیے اور پھر جب اُحد کی باری آئی تو ایک منزل ایسی بھی آتی ہے کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ میدان سے ہٹ گئے تھے تو پیغمبرؐ کے گرد علیؑ پروانہ وار گھوم رہے تھے تو ارشاد فرمایا کہ اے علیؑ! جیسے اور چلے گئے آپ کیوں نہیں گئے؟

تو جناب امیرؑ جواب دیتے ہیں کہ یارسولؐ اللہ!

أَأَكْفُرُ بَعْدَ الْإِيمَانِ

"کیا میں ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاؤں؟"

یعنی محمدؐ سے وعدہ کیا ہو، رسولؐ سے وعدہ کیا ہو، نصرت کا اور اس وعدے کو چھوڑ دوں۔

لہٰذا اس میدان میں علیؑ نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ فرشتوں نے آسمان وزمین کی درمیانی فضا میں یہ قصیدہ پڑھا:

لَا فَتٰی اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار

"اگر کوئی جوان ہے تو علیؑ ہے، اگر تلوار ہے تو ذوالفقار ہے"۔

پھر اس کے بعد خندق کی لڑائی ہوئی، پھر خیبر کی لڑائی ہوئی، پھر حنین کی لڑائی ہوئی، جتنی لڑائیاں ہوئیں ان سب لڑائیوں کے علم دار علیؑ، ان کے فاتح علیؑ اور ان کے ہیرو علیؑ۔ ہر منزل پر علیؑ نے جو وعدہ کیا تھا اس کو نبھایا۔

تو کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ علیؑ تو ہر منزل پر اپنے ہر وعدے کو نبھائیں اور پیغمبرؐ نہ نبھائیں؟ یقیناً نبھایا ہوگا بلکہ جہاں بھی کوئی موقع ملتا تو پیغمبرؐ علیؑ کی مدح وثناء کرتے تھے۔

اور میں کہا کرتا ہوں کہ آدمی ہوتے ہیں تین قسم کے: ایک وہ جو بہت ذہین ہوتے ہیں مثلاً آپ کسی کا تعارف کرانا چاہتے ہیں تو آپ نے اشارہ کیا اور وہ سمجھ جاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ وہ ہیں تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ کس کا تعارف کرا رہے ہیں۔

دوسرے کچھ لوگ ہوتے ہیں متوسط دماغ کے، اُن کے لیے صراحتاً یہ کہنا پڑتا کہ جس کا میں تعارف کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے:

تیسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو نہ تو اشارے سمجھتے ہیں اور نہ تصریحات ان کی سمجھ میں آتی ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ اس آدمی کا ہاتھ

پکڑ کر بتایا جائے وہ یہ ہے۔ تو اب پیغمبرؐ نے اشاروں اور کنائیوں کے ساتھ سمجھایا۔ اور آخری مرتبہ رسولؐ نے میدانِ غدیر خم میں بالکل صراحت کے ساتھ بتایا کہ وہ یہ ہے۔

بہت بڑا میدان تھا۔ گرمی بھی تھی، شامیانہ بھی نہیں تھا۔ درخت بھی وہاں نہیں تھے۔ جنگل و بیابان میں رسول حکم دیتے ہیں کہ جو لوگ آگے چلے گئے ہیں ان کو واپس بلاؤ اور جو پیچھے رہ گئے ہیں ان کا انتظار کرو۔ سب آگئے تو وہ پیغمبرؐ اتنا عرصہ بغیر منبر کے خطبہ دیتا رہا وہ کہتا ہے کہ یہاں منبر بناؤ۔

لہٰذا پالانوں کا منبر بنایا گیا اور اس منبر پر اپنے ساتھ علیؑ کو اپنے ساتھ بٹھایا گیا۔ گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ جو آپ نے خطبہ دیا، علیؑ سامنے بیٹھے رہے تاکہ دنیا کی نگاہیں اُٹھتی رہیں کہ یہی ہے وہ کہ جس کے متعلق اعلان کریں گے اور اس کی تصویر ان کے دلوں میں بیٹھ جائے۔

جب پیغمبرؐ خطبہ مکمل کر چکے تو آخر میں اعلان فرمایا کہ کیا میں تمہارے نفسوں پر تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا؟ یعنی کیا تمہارا حاکم یا مولاؐ نہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں بے شک آپ ہمارے مولا بھی ہیں اور حاکم بھی ہیں۔

اب پیغمبر کی عمر ۶۳ برس ہے اور بڑھاپا بھی ہے اور علیؑ ۳۵ برس کے جوان ہیں۔ وہ علیؑ کہ جس نے خیبر کے دروازے اکھاڑے تھے، اتنے قوی اور طاقت ور جوان کو پیغمبرؐ نے صرف یہ نہیں ہے کہ صرف ہاتھ پکڑ کر دکھایا بلکہ اپنے سامنے کھڑا کیا اور اتنا بلند کیا کہ دونوں بھائیوں کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔

تو ایک جوان کو اگر کوئی اپنے آگے کھڑا کرے تو کیا کھڑا کرنے والا آدمی نظر آتا ہے؟ وہ تو نظر نہیں آتا مگر وہ نظر آتا ہے جس کو سامنے کھڑا کیا ہے۔ تو کھڑا

کر کے ارشاد فرمایا کہ دیکھو کہ جب میں نہ ہوں تو یہ ہے۔ (نعرۂ حیدری)

اور ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا:

مَن کُنتُ مَولَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَولَاہُ

اور میں عرض کر رہا تھا کہ پیغمبر کو ایسا کرنا چاہیے اس لیے ہر عقل مند جس مشن کو لے کر آتا ہے اگر اس کی حفاظت کے انتظامات وہ نہیں کر کے جاتا تو اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے مشن کے ساتھ اس کو پیار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی علیؑ کا تعارف کراتے ہیں۔ کبھی علیؑ کے بیٹوں کو بھی ساتھ لے کر کبھی چادر تطہیر میں لے کر ان کا تعارف کراتے ہیں اور کبھی میدانِ مباہلہ میں لے جا کر ان کا تعارف کراتے ہیں۔ کبھی ان کو اپنے کاندھوں پر سوار کرا کر واللّیل کی زلفوں کو ان کے ہاتھوں میں دے کر مدینہ کی گلیوں میں پھر پھر کر ان کا تعارف کراتے ہیں تا کہ دنیا پہچان لے کہ میرے دین کے محافظ یہ ہیں۔

اور خدا گواہ ہے کہ جس طرح پیغمبرؐ نے تعارف میں کسر نہیں چھوڑی اسی طرح انہوں نے بھی دین کی حفاظت میں کسر نہیں چھوڑی۔ تو جب بھی کبھی وقت آیا دین پر تو یہی خاندان حفاظت کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

چناں چہ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ دو اماموں کے بارے میں یہ واقعہ لکھا گیا ہے۔ امام موسیٰ کاظمؑ کے متعلق بھی ہے اور امام حسن عسکریؑ کے بارے میں بھی ہے اور لکھا یہ ہے کہ امام اس وقت قید میں تھے اور یہ واقعہ دو دفعہ پیش آیا۔ اسی لیے مورخین نے دونوں اماموں کے حالات میں لکھا ہے کہ قحط پڑ گیا اور بارش نہیں ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے نمازِ استسقا پڑھی لیکن بارش نہ ہوئی۔ اس کے بعد عیسائیوں کا ایک پادری اپنے شاگردوں کو ساتھ لے کر اسی میدان میں گیا

تو انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو بادل آ گئے اور بارش ہو گئی۔ جب بارش ہو گئی تو ظاہر ہے کہ جب نیتیں کھوکھلی ہوں تو پھر انسان کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

تو اب لوگ سوچنے لگے کہ شاید ان کا مذہب صحیح ہے۔ چناں چہ خلیفۂ وقت تک اطلاع پہنچی کہ کام خراب ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ تو اس نے خود کوئی جواب نہیں دیا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ محافظ کون ہیں، لہٰذا قید خانے میں پیغام بھیجا یہ کہہ کر کہ:

اَدرِکْ دِیْنَ جَدِّکَ

"کہ اپنے نانا کے دین کی مدد کرو"۔

تو آپ نے فرمایا: اچھا، کوئی بات نہیں ہے، اعلان کرا دو۔ اسی میدان میں کہ شک وشبہ کو دُور کیا جائے گا۔

چنانچہ اس میدان میں مسلمان بھی آ گئے اور ان عیسائیوں کو بھی بلایا گیا اور وہ پادری بھی آیا اور آپ نے اس سے کہا کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرو۔ اب اس نے جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بادل آ گئے۔ آپ نے ایک شخص سے کہا: اس کی انگلیوں کے اندر جو چیز ہے اس کو نکال لو۔ وہ چیز نکال لی گئی۔ فرمایا اس کو چھپا لو۔ اس کو چھپا دیا گیا۔

فرمایا: اب دعا کے لیے ہاتھ بلند کرو۔ اب جو اس نے ہاتھ بلند کیے تو کوئی بھی بادل نہ آیا۔ کہا گیا کہ یہ کیا؟

آپؑ نے فرمایا کہ اس کے ہاتھ میں کہیں سے کسی نبیؑ کی ہڈی آ گئی ہے اس لیے بادل آ گئے۔ یہ تو اس ہڈی کی کرامت ہے، اس پادری کا کوئی کمال نہیں۔

کیونکہ جب وہ ہڈی سورج کے سامنے آتی ہے تو بادل اس پر سایہ کرتے ہیں چوں کہ نبیؐ کے جسم کا ایک حصہ ہے اور نبیؐ پر بھی بادل سایہ کرتے تھے تو یہ تو اس کی کرامت نہیں ہے بلکہ یہ تو اس ہڈی کا صدقہ ہے۔

اس کے بعد آپؑ نے دعا کی تو بادل گڑگڑانے لگے۔ تو ان بادلوں کو دیکھ کر لوگوں نے بھاگنا شروع کیا۔ امامؑ نے فرمایا: بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تم سب اپنے اپنے گھروں میں نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک بادل نہیں برسیں گے۔

ذکرِ مصائب: قافلہ حسینؑ شہر بہ شہر

تو میرے دوستو______!

دنیا بھی یہی سمجھتی تھی کہ یہ محافظ ہیں اور یہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ ہم دین کے محافظ ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب یزید نے علی الاعلان دین کی مخالفت شروع کی۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ منبر رسولؐ پر بیٹھ کر جو شخص اپنے آپ کو خلیفۂ رسولؐ کہلوائے وہ اگر کہے کہ کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، فرشتہ نہیں آیا، یہ تو ڈھونگ تھا بنو ہاشم کا، پھر بھی کچھ دین رہ گیا تھا؟ اور کسی میں جرأت نہیں ہے کہ وہ اس کو ٹوکے۔ وہ علی الاعلان شراب پیتا ہے، یہاں تک وہ کہتا ہے کہ حسینؑ تیرے ناناؐ نے سونے کے برتنوں کو حرام قرار دیا تھا میں نے آپ کا سر سونے کے برتن میں رکھا ہے۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اس کے حکم سے مدینہ رسولؐ کو لوٹا گیا۔ اصحابِ رسولؐ کو قتل کیا گیا تو جو مسلمانوں کو قتل کرے، جو صحابہ کو قتل کرے، جو رسولؐ کے روضہ کا احترام نہ کرے، جو مسجد نبویؐ میں گھوڑے بندھوائے، خانۂ خدا کی

توہین کرے، جو غلافِ خانہ کعبہ کو جلوائے، جس کے حکم سے خانۂ کعبہ کی دیواروں میں دراڑیں آ جائیں اگر وہ بھی امیرالمومنین ہے تو پھر باقی رہ کیا گیا ہے۔

لیکن زہراءؑ کے لال نے جب یہ دیکھا تو فرمایا کہ وطن مدینہ چھوڑا جا سکتا ہے، باندھے ہوئے احرام توڑے جا سکتے ہیں، بیوی اور بچوں کے ساتھ صحراؤں میں جایا جا سکتا ہے۔ جنگل کی بھوک اور پیاس برداشت کی جا سکتی ہے۔ حبیبؓ و مسلمؑ جیسے یار و انصار قربان کیے جا سکتے ہیں۔ اکبرؑ کے سینے میں برچھی لگ سکتی ہے، قاسمؑ کی لاش پامال ہو سکتی ہے، عباسؑ کے بازو کٹ سکتے ہیں۔ اصغرؑ کے گلے پر تیر چل سکتا ہے۔ زینبؑ کی چادر چھن سکتی ہے، سکینہؑ کے گوشوارے لٹ سکتے ہیں۔ بیبیاں قید ہو کر درباروں اور بازاروں میں جا سکتی ہیں لیکن حسینؑ ناناؐ کے دین کو مٹنے نہیں دے گا۔ لہٰذا کربلا کے میدان میں حسینؑ کی آواز گونج رہی ہے:

> ''اگر دینِ محمدؐ کی بقا اسی میں ہے کہ زہراءؑ کے لال کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو آؤ تلوارو! مجھ پر ٹوٹ پڑو''۔

عزادارو ـــــ!

خدا آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے جنابِ سیدہؑ کے دل کو خوش کیا۔ آپ تو شامِ غریباں کی مجلس سننے کے بعد راحت و آرام سے جا کر سوئیں گے۔ آپ سیاہ لباس اُتار دیں گے، یہ عزاداری کی کیفیت آپ ختم کر دیں گے لیکن آپ جانتے ہیں کہ زینبؑ کی عزاداری کب ختم ہوئی؟ اُم کلثومؑ کی عزاداری کب ختم ہوئی؟ جنابِ سیدہؑ کی عزاداری کب ختم ہوئی، ان کے مصائب تو گیارھویں کے بعد شروع ہوں گے۔

یاد رکھو عزادارو ـــــ!

حسینؑ کو یہ دین بڑا عزیز تھا، بڑا پیارا تھا۔ آپ نے ذاکروں اور علماء سے بھی سنا ہے کہ ۷۲ مارے گئے لیکن اگر تاریخ کربلا کا مطالعہ کریں تو نہ معلوم حسینؑ نے کتنی قربانیاں دیں۔

مشہور یہی ہے کہ جب یہ قافلہ مدینہ سے چلا تھا تو ۵۳ یا ۶۳ محملوں پر بیبیاں اور بچے سوار تھے اور جب کربلا میں پہنچے اور واقعہ کربلا ہو چکا۔ تب بھی شیخ عباس قمی لکھتے ہیں ۴۰ اُونٹ تھے جن پر بیبیاں اور بچے سوار تھے۔ تو اگر ہر اُونٹ پر دو سواریاں بھی ہوں تو ۸۰ بنتے ہیں۔

لیکن آپ کے بیمار امام سید سجاد علیہ السلام کہتے ہیں کہ جب ہم کربلا سے کوفے اور کوفے سے شام تک پہنچے اور شام کے بازاروں سے گزر کر دربار یزید میں پہنچے تو ہم ۱۷ افراد رہ گئے تھے۔ جو ایک ہی رسّی میں بندھے یزید کے دربار میں داخل ہو رہے تھے۔

اب ذرا غور کریں ــــــ!

کہ اتنے اُونٹوں پر بیٹھنے والے بچے کہاں گئے؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماؤں کے ہاتھ تو بندھے ہوئے ہوتے تھے نا۔ تو اب یہ بچوں کا کام تھا کہ وہ ماؤں کے دامن کے ساتھ لپٹے رہیں۔

اولاد والو ــــــ!

جب اُونٹ تیز چلتے تھے اور بچے تھک جاتے تھے تو دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتے۔ تھے اور جب دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتے تھے تو بچے زمین پر گر جاتے تھے اور ماؤں کو اتنی مہلت نہیں ملتی تھی کہ بچوں کو اُٹھا سکیں۔ لہٰذا وہ بچے وہیں تڑپ تڑپ کر مر جاتے تھے۔

اور اس کا گواہ ہے وہ واقعہ جس کو سید نعمت اللہ جزائری نے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک ایسی منزل آئی کہ سرِ حسینؑ جس نیزے پر تھا وہ نیزہ زمین میں گڑ گیا۔ کوششیں کرنے کے باوجود جب سرِ حسینؑ آگے نہ بڑھا تو شمر سید سجادؑ کے پاس آیا اور آ کر کہا کہ اے قیدی، آپ کے باپ کا سر آگے کیوں نہیں بڑھتا؟

فرمایا: ہماری سواری گر گئی۔

عزادارو۔۔۔۔۔!

معلوم ہوا کہ حسینؑ کے سینے پہ سونے والی نہیں ہے۔ اب سید سجادؑ نے پھوپھی کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ اے پھوپھی اماں! آپ جانتی ہیں کہ میں بیمار ہوں اور مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ آپ جائیے اور بچی کو تلاش کیجیے۔

عزادارو۔۔۔۔۔!

میں نے فقرہ کہہ دیا اور آپ نے سن لیا۔ یہ کس زینبؑ سے کہہ رہے ہیں کہ جس کی ماں کا جنازہ رات کو اُٹھا تھا۔ جو ناناؐ کے روضے پر رات کو جایا کرتی تھی۔ جن کے دروازے پر فرشتے آ کر رُک جاتے تھے۔ جب تک اجازت نہیں ملتی تھی تو اندر نہیں آتے تھے۔

آج بے مقنع و چادر ہے زینبؑ، اس کے سر پر تو چادر بھی نہیں ہے۔ اس سے سید سجادؑ کہہ رہے ہیں کہ پھوپھی، یہ وہی زینبؑ ہے کہ جب چار سال کی تھیں اور ماں کے جنازے میں رات کی تاریکی میں، اور برقعہ پہنے ہوئے جا رہی تھیں، علیؑ نے جنازہ رُکوا دیا اور کہا تھا کہ حسینؑ بہن کو گھر واپس لے جاؤ۔

میں عرض کروں گا: یا علیؑ! آج آ کر دیکھیے، وہی زینبؑ ہے جو بے مقنع و چادر ہے۔ دشمنوں کا مجمع ہے اور سید سجادؑ مجبوراً ان سے کہہ رہے ہیں کہ پھوپھی

یہ آپ جا کر بچی کو لے آیئے۔

عزادارو ــــــ!

زینبؑ چلی، چلتے چلتے آوازیں دے رہی ہے سکینہؑ کہاں ہو، بیٹی آجاؤ، قافلہ رُکا ہوا ہے، ظالم ہم پر ظلم کرتے ہیں۔

عزادارو ــــــ!

چلتے چلتے ایک نشیب میں دیکھا کہ ایک سیاہ برقعہ پوش بی بی ہے۔ اس نے بچی کو اپنی گود میں اٹھایا ہوا ہے، پیار کر رہی ہے، محبت کی باتیں کر رہی ہے، یہ دیکھنا تھا کہ پہلے تو ثانیٔ زہراؑ نے بچی سے کہا کہ بیٹا میری گود میں آجاؤ۔ قافلہ رُکا ہوا ہے۔ جب بچی کو لے چلی تو علیؑ کی غیور بیٹی اس بی بی کی طرف مخاطب ہوئیں: کہا کہ بی بی! آپ نے بڑی شفقت کی، بڑی مہربانی کی، آپ کا بڑا احسان ہے کہ آپ نے ہماری بچی کو گود میں بٹھایا، پیار کیا لیکن ہائے افسوس کہ علیؑ کی بیٹی تجھے اس وقت احسان کا بدلہ نہیں دے سکتی۔ اس لیے کہ گھر ہی اُجڑ گیا، بھائی مارے گئے، بیٹے نہیں رہے، کچھ رہا ہی نہیں۔

البتہ اتنا وعدہ کرتی ہوں کہ قیامت کا دن ہونے دو، ماں زہراؑ سے تمہاری سفارش ضرور کروں گی کہ اے اماں! اس بی بی نے ہماری اس بچی کو گود میں اٹھایا ہے، پیار کیا تھا، شفقت سے پیش آئی تھی۔

عزادارو ــــــ!

یہ سننا تھا کہ اچانک اس عورت نے نقاب اُلٹ دیا اور کہا کہ میری بچی میری طرف دیکھو کہ میں کون ہوں۔ اے میری دُکھیا بیٹی! میں تمہاری ماں فاطمہ زہراؑ ہوں، تو نے مدینہ چھوڑا، ماں تیرے ساتھ ساتھ ہے، جہاں جہاں تمہارا

قافلہ جاتا ہے۔

گویا کہہ رہی تھی کہ زینبؑ کربلا کے میدان میں تو تو خیموں میں تھی لیکن میں نے ایک ایک شہید کو شہید ہوتے دیکھا۔ اکبرؑ کو نیزہ لگتے دیکھا۔ عباسؑ کے کٹتے ہوئے بازو دیکھے۔ اصغرؑ کے گلے پر تیر چلتے ہوئے دیکھا اور جب میری گود کا پالا ہوا شمر کے خنجر کے تلے ذبح ہو رہا تھا تو تو خیمے کے دروازے پر تھی لیکن میں کہتی رہی کہ اے شمر! میں نے لوریاں دے دے کر پالا ہے۔ میں اس کا بال بھی بیکا نہیں ہونے دیتی تھی۔ میرا بچہ ذبح ہو گیا۔

عزادارو------!

آج آخری رات ہے، زینبؑ سے کہو کہ عونؑ و محمدؑ کو دیکھ لے۔ لیلیٰؑ سے کہو کہ اکبرؑ کے چہرے کی زیارت کر لے، اُم فروہؑ سے کہو کہ قاسمؑ کو سنوار لے۔ آج خیامِ حسینؑ میں ماں کے پاس بیٹا بھی موجود ہے۔ بہن کے پاس بھائی بھی موجود ہے۔ بیٹی کے پاس باپ بھی موجود ہے، بس آج کی رات ہے۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ سادات کے لیے آج کی رات مشکل تھی یا کل کی رات مشکل تھی۔

●......●......●

مجلس دہم

- اپنی مظلومیت کی کشش سے دنیا کو ذکرِ حسینؑ کی طرف مائل کر کے بھی دین کو بچایا۔
- جتنا وہ عظیم تھا اتنا اس واقعے میں عظمت پیدا ہوگئی۔
- اچھے خاندان کا آدمی ضروری ہے کہ اچھا ہو اور بُرے خاندان کا آدمی مجبوراً بُرا ہو۔
- مذہب شیعہ کے نزدیک جہاں جبر آجائے گا وہاں عقیدہ صحیح نہیں ہوسکتا۔
- اگر خدا ہی یہ سب کچھ کراتا ہے تو پھر جنت وجہنم کو کیوں پیدا کیا؟
- وہ شخص جو بُرا اعمال کرتا ہے وہ جہنم میں جائے گا اگرچہ وہ سید ہی کیوں نہ ہو۔
- جب کسی ایک نے نہ کیا تو ہمیشہ کے لیے وہ ملعون ہوگیا۔
- جس نے ایک انسان کو بے جرم قتل کیا تو گویا اس نے پوری دنیا کو قتل کیا۔
- چاہے کلمہ بھی نہ پڑھتے ہوں، آتا نہیں ہے تو پڑھیں گے کہاں سے؟

ذکرِ مصائب

- شہادت جنابِ علی اکبرؑ

مجلسِ دہم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ارشادِ رب العزت ہے:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (سورہ آل عمران، آیہ ۱۹)

"جو یقیناً اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے"۔

دوستو اور بزرگو!!

کل کی مجلس اور گذشتہ مجالس کا خلاصہ یہ تھا کہ سید الشہداءؑ نے اپنا سر و گھر قربان کر کے بھی بچایا اور اپنی مظلومیت کی کشش سے دنیا کو ذکرِ حسینؑ کی طرف مائل کر کے بھی دین کو بچایا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب بھی اس کے کانوں میں یہ آواز پہنچے کہ فلاں مقام پر کوئی مارا گیا ہے، ختم ہو گیا ہے۔ جیسا کہ آپ عموماً اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں اور کسی سے پوچھتے رہتے ہیں۔ جب بھی یہ خبر آنکھوں سے دیکھیں یا کانوں سے سنیں تو فطرتی طور پر تین سوال ہر شخص کے ذہن میں اُبھرتے ہیں۔ پہلا سوال یہ کہ کون مارا گیا؟ دوسرا سوال یہ کہ اس کو کس نے مارا؟ اور تیسرا سوال یہ کہ اس کو کیوں مارا گیا؟

یہ فطرت ہے انسان کی، بوڑھا ہو، بچہ ہو، عورت ہو، مرد ہو، اس خبر کے

سننے یا دیکھنے کے بعد یہ تین سوالات یقیناً اس کے ذہن میں اُبھریں گے۔ چاہے ان کا جواب اسے مل سکے یا نہ مل سکے۔ تو ۶۱ ہجری سے لے کر آج تک دنیا کے کسی خطے میں جو شخص پیدا ہوا، اور منزل شعور و ادراک تک پہنچا، تو کسی نہ کسی ذریعہ سے، کسی نہ کسی وسیلہ سے، چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، کسی ملک کا رہنے والا ہو، کسی زمانے میں اس نے جنم لیا ہو، کسی گاؤں میں وہ پلا بڑھا ہو، کسی ماحول میں وہ رہا ہو۔ کسی نہ کسی ذریعہ سے، کبھی نہ کبھی اس کے کانوں کے ساتھ یہ آوازیں یقیناً ٹکرائی ہوں گی کہ کربلا میں کوئی مارا گیا تھا تو لہٰذا جب بھی یہ آواز ٹکرائے تو فطرتاً ان سوالات کا پیدا ہونا ضروری ہے کہ وہ کون مارا گیا تھا؟ کس نے مارا تھا؟ اور کیوں مارا گیا تھا؟

شاید میں اس مجلس میں پہلے سوال کا کچھ حصہ بیان کرسکوں۔ پہلا سوال یہ کہ وہ کون تھا؟ جتنا وہ عظیم تھا اتنا اس واقعے میں عظمت پیدا ہوگی۔

اب عظمت کے تین زاویے ہیں۔ تین جہتوں سے، تین پہلوؤں سے، کسی شخص کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پہلی منزل یہ ہے کہ یہ شخص کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ دوسرا یہ کہ خالق کائنات نے اس کو کن کن خوبیوں سے نواز ہے اور تیسرا یہ کہ اس شخص نے خود دنیا میں رہ کر کیا کیا ہے؟

یہ تین زاویے ہیں۔ یہ آپ لکھنا چاہیں، کچھ کہنا چاہیں، کسی شخص کے متعلق، اس کو سمجھنا چاہیں تو ان تین زاویوں سے کسی شخص کی عظمت یا پستی ظاہر ہوجاتی ہے کہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ خدا نے وہبی طور پر کون کون سے کمالات اسے عطا کیے ہیں؟ اور خود اس نے دنیا میں رہ کر کیا کچھ کسب کیا ہے؟ تین زاویے ہیں۔ تو اب ان میں سے مَیں اس مجلس میں صرف پہلے زاویے کو ہی

بیان کرسکوں گا۔

یہ بات تو اب روزِ روشن کی طرح آشکار ہوچکی ہے کہ صفات کا پایا جانا ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ سب انسانوں میں نہیں، بلکہ جانوروں تک اس چیز کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ جانور کس خاندان سے، کس نسل سے تعلق رکھتا ہے؟ اور اسی طرح انسانوں میں بھی خاندان اور جب سے ان باتوں کا خیال چھوڑا گیا اور ان کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا۔

بہرحال خاندانی عزت جو بزرگوں کی صفات ہیں، اچھے یا بُرے تو ان سے عموماً تخصص نہیں ہوتا، اگرچہ وہ منزل جبر تک پہنچتا معاملہ کہ مجبور ہو کہ اچھے باپ کا بیٹا خواہ مخواہ ہی اچھا ہو اور بُرے باپ کا بیٹا خواہ مخواہ ہی بُرا ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کو اچھا ماحول مل جائے، اس کا ضمیر زندہ ہوجائے، تو وہ مثلاً بُرے خاندان سے تعلق رکھنے والا آدمی اچھا ہوجائے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں ایک واقعہ میرے ذہن میں آگیا۔ بنواُمیہ کا خاندان۔

بہرحال ـــــ!

بڑی معذرت کے ساتھ کہ پیغمبرِؐ اسلام کی حدیث متفق بین الفریقین ہے کہ اس خاندان کو۔

تو بہرحال ـــــ!

قرآن کی رُو سے "شجرۂ ملعونہ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور پیغمبرؐ کے ارشادات بھی موجود ہیں۔ اس خاندان کا ایک فرد جس کا نام سعد تھا اور وہ چوں کہ بہت نیک تھا اس لیے اس کو سعد الخیر کہتے تھے۔ سعد کا معنی بھی خیر، اور خیر کا معنی بھی خیر، تو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور رونے لگا۔

آپؑ نے فرمایا کہ سعد کیوں روتے ہو؟

عرض کیا: مولاؑ! میں ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں کہ جس کے ہر فرد کا جنت میں جانا انتہائی مشکل ہے۔ مجھے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اس خاندان کی نحوست مجھ پر بھی اثرانداز نہ ہو

آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ خدا کے ہاں معیار خاندان سے ہونا نہ ہونا نہیں ہے کہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور کس سے نہیں رکھتا۔ یہ آئینِ خدا کے خلاف ہے کہ اچھے خاندان کا آدمی ضروری ہے کہ اچھا ہو اور بُرے خاندان کا آدمی مجبوراً بُرا ہو۔

تو بہرحال ____!

مذہب شیعہ کے نزدیک جہاں جبر آجائے گا وہاں عقیدہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ ایک واقعہ ہے کہ ایک بہت بڑے امام حضرت صادق علیہ السلام کی ملاقات کے لیے تشریف لے آئے تو وہ باہر بیٹھ گئے۔ اسی اثنا میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ بھی جو نوعمر تھے، وہاں تشریف لائے تو لوگ تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے لیکن اس نے سوال کیا کہ یہ کون ہیں؟ تو بتایا گیا کہ حضرتؑ کے صاحب زادے ہیں اور کہنے لگے کہ اے جوان! گناہ کس کی طرف سے ہوتا ہے، یہ گناہ بندہ کرتا ہے یا خدا کی طرف سے ہوتا ہے......

ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ کسی جنگ سے ایک بزرگ بھاگے تھے تو کسی شخص نے سوال کیا کہ یہ کیا کر رہے ہو حالاں کہ پیغمبرؐ خدا وہاں ہیں تو وہ شخص کہنے لگا کہ خدا کی مرضی ہے۔

تو بہرحال ____!

یہ ایک نظریہ، پتہ نہیں کیوں پیدا کر دیا گیا اور عموماً یہ فقرہ رائج ہو گیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے کہ غلط کام ہو جائے تو کہتے ہیں خدا کی مرضی، یعنی گناہ بندہ کرے اور اس کی ذمہ داری خدا کے سپرد۔ اگر خدا ہی یہ سب کچھ کراتا ہے تو پھر جنت و جہنم کو کیوں پیدا کیا؟ نہ اس دنیا میں لانے کی ضرورت تھی نہ اعمال کرانے کی ضرورت تھی۔ تو یہ تو سارا نظام ہی غلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر سب کچھ خدا ہی کراتا ہے تو۔

تو بہر حال ـــــ!

اس بزرگ نے بھی امامؑ سے یہی سوال کیا کہ بتاؤ گناہ کس کی طرف سے ہے تو آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ معاملہ تین حالتوں سے خالی نہیں ہے۔ یا ٹوٹل طور پر، مکمل طور پر گناہ خدا کی طرف سے ہے تو سزا بھی اسی کو ہونی چاہیے۔ اور اگر خدا اور بندہ مل کر مشترکہ طور پر کرتے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ سزا بھی دونوں کو ہونی چاہیے۔ اور اگر یہ دو باتیں صحیح نہیں ہیں اور یقیناً صحیح نہیں ہیں تو گناہ بندے کی طرف سے ہوتا ہے۔

تو بہر حال ـــــ!

میں سعد کا واقعہ عرض کر رہا تھا اس نے کہا: مولاؑ! مجھے یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں کہ جو صحیح خاندان نہیں ہے۔ تو آپؑ نے فرمایا کہ نہیں خدا کے ہاں یہ معیار نہیں ہے بلکہ خدا نے فیصلہ کیا ہے کہ

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ

کہ ہم نے مختلف شعبوں اور قبیلوں میں تمہیں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو۔

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (سورۂ حجرات، آیت ۱۳)

"سب سے محترم اور مکرم وہ شخص ہے کہ جس میں تقویٰ زیادہ ہے"۔

اور یہی وجہ ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کا بھی ارشاد ہے اور حضرت امام زین العابدینؑ کا بھی ارشاد ہے کہ وہ شخص جو صحیح عقیدے کے ساتھ اطاعت پروردگار کرتا ہے اور خدا کے احکام کو صحیح طور پر بجالے آتا ہے تو وہ جنت میں جائے گا۔

وَلَوْ کَانَ عَبۡدًا حَبۡشِیًّا

"چاہے وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو"۔

اور وہ شخص جو بُرے اعمال کرتا ہے، وہ جہنم میں جائے گا۔

وَلَوْ کَانَ سَیِّدًا

میرے عزیزو!

عموماً بدبختی ہے وہ منبر کہ جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو دین دار بنایا جائے، دین کی طرف مائل کیا جائے، وہ فن کی شکل اختیار کر گیا۔ اب وہ مقاصد جو منبر سے وابستہ تھے، الحمدللہ آہستہ آہستہ پورے ہوتے جا رہے ہیں اور ظاہر ہے جہاں تک اس سلسلے میں اہلِ منبر کی ذمہ داریاں ہیں وہاں آپ مجلس سننے والے لوگوں کی بھی ذمہ داریاں ہیں اور جب ہم یہ بات کرتے ہیں کہ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ جلوس میں نماز ہونی چاہیے تو کہتے ہیں کہ جی یہ تو جلوس کے خلاف ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ منبر پر وہ باتیں ہونی چاہئیں کہ جن سے قوم کی تربیت ہو، تو کہا یہ جاتا ہے کہ یہ لوگ فضائل اہلِ بیتؑ کو پسند نہیں کرتے، نا معلوم کہ کیا کچھ کہا جاتا ہے۔ آپ حضرات بہتر جانتے ہیں۔

بہرحال ــــــ!

میری گزارش یہ ہے کہ جس طرح آلِ محمدؐ نے ان مجالس کو درس گاہ بنایا تھا، اسی طریقے سے انہیں دوبارہ درس گاہ بنائیں۔

تو حضرتؑ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ہاں معیار یہ نہیں ہے کہ فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ براہِ راست آدمؑ کا ایک بیٹا تھا، صلبی بیٹا تھا، ابوالبشر تھا، وہ نبیؑ بھی تھے، وہ رسولؑ بھی تھے، اور اتنے عظیم تھے کہ لاکھوں کروڑوں سال بزمِ قدرت میں رہنے والے معصوم ملائکہ کو حکم ہوا کہ اس کے سامنے سجدہ کرو اور جب کسی ایک نے نہ کیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ ملعون ہوگیا۔ تو یہ عظمت ہے جنابِ آدمؑ کی۔ تو ان کے دو بیٹوں میں ایک بیٹا مظلوم ہے اور ایک بیٹا ملعون ہے۔

قرآن کہتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (سورۂ مائدہ، آیہ ۳۲)

"یعنی جس نے ایک انسان کو بے جرم قتل کیا تو گویا اس نے پوری دنیا کو قتل کیا"۔

اس لیے کہ ایک انسان میں خلاقِ عالم نے اتنی استعداد رکھی ہے کہ اس سے ایک دنیا آباد ہوسکتی ہے۔ یہ انسان معمولی شے نہیں ہے۔ ہم نے تو اپنی حقیقت کو ہی پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ خلاقِ عالم نے بہت بڑی عظمت دی ہے انسان کو۔

جناب امیر علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے انسان!

اَتَزْعَمُ اَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيْرٌ وَفِيْكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْاَكْبَرُ

''اے انسان کیا تو خیال کرتا ہے کہ ایک تو چھوٹا سا جسم ہے،
تجھ میں تو یہ پورا عالمِ اکبر سمایا ہے''۔

یہ پورا عالمِ اکبر سے مراد، یہ نہیں ہے کہ جہاں تک ہماری نگاہ جاتی ہے، بلکہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ عالمِ اکبر اتنا بڑا ہے کہ جس کے ایک معمولی سے حصے کا بھی ابھی تک انکشاف نہیں ہوا۔ اور وہ عالم کتنا ہے تو یہ تو یا پیدا کرنے والا جانتا ہے یا جس کو اس نے بتایا ہے وہ جانتا ہے۔

تو بہرحال ـــــ!

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سعد سے امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ کسی خاندان سے ہونا یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ آدمی خواہ مخواہ جہنم میں جائے، بلکہ اگر اس کا عقیدہ صحیح ہے، اگر اس کا عمل صحیح ہے تو چاہے وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، تو وہ جنت میں جائے گا۔

اس کے بعد آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ

سَعدُ الخَیرِ رَجُلٌ مِن بَنِی اُمَیَّه مِنَّا اَهلِ البَیتِ

''کہ سعد الخیر اگرچہ بنی اُمیہ کے خاندان کا ایک فرد ہے لیکن
اپنے عقیدے اور عمل کی بنا پر ہم اہلِ بیتؑ میں سے ہے''۔

تو بہرحال ـــــ!

میرا مقصد اتنی تشریحات کرنے کا یہ تھا کہ غلط فہمی نہ ہو، کہ ہم فلاں خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو لہٰذا ہم جنت میں جائیں گے اور وہ فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہے وہ جہنم میں جائے گا۔

خدا کے ہاں، خدا کی کسی سے رشتہ داری نہیں ہے۔ خدا کے نزدیک ساری

اس کی مخلوق ایک جیسی ہے۔ لیکن اچھے ماحول میں پیدا ہونے والے انسان عموماً اچھے ہوتے ہیں اور بُرے ماحول میں پیدا ہونے والے افراد عموماً بُرے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ماحول اثرانداز ہوتا ہے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان کے اخلاق اور اس کے کردار کو مزین اور آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے سب سے پہلے ماں کی گود ہے، بلکہ اس سے بھی پہلے، کہ جناب امیرؑ اور سرکار رسالتؐ اور پورا دین و مذہب یہ کہتا ہے کہ مثلاً آپ نے اگر شادی کرنی ہے تو ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ کھاتے پیتے لوگ ہیں یا نہیں، یہ کہ یہ لوگ دین دار بھی ہیں، چاہے کلمہ بھی نہ پڑھتے ہوں، آتا ہی نہیں ہے تو پڑھیں گے کہاں سے؟

تو حضرتؑ نے ارشاد فرمایا کہ بچو! تم اس سبزی سے کہ جو کوڑے کرکٹ پر اُگی ہوئی ہو۔

عرض کیا گیا کہ یارسولؐ اللہ! اس کا معنی کیا ہے؟

فرمایا کہ ظاہراً خوبصورت خاتون لیکن جہاں وہ پیدا ہوئی ہے وہ ماحول اچھا نہیں ہے لہٰذا اس لیے کہا گیا کہ اصل وہی دین و شرافت ہے، وہ معیار ہے۔ ماحول اثرانداز ہوتا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ چونکہ ماحول خاندانی ہوتا ہے۔ تاجر حضرات عموماً مثلاً دو صفات عموماً تاجروں میں پائی جاتی ہیں۔ ایک بخل اور بزدلی۔

نہج البلاغہ میں حضرتؑ نے جو خطبہ مالک اشتر کو دیا وہ دستورنامہ میں لکھ دیا تھا اس میں لکھا ہوا ہے۔ تو ظاہر ہے!

یہ مفید ترین طبقہ ہے تجارت کا، اگر کسی ملک کی تجارت نہ ہو تو وہ ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اور عموماً مذہبی کام، بنیادی کام اس وقت اس ملک میں ہو رہے

ہیں وہ اِن تاجروں کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ اور اگر یہ حضرات ہمارا ساتھ نہ دیں تو ظاہر ہے کہ ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔

تو بہرحال ــــ!

اب اس ماحول میں پیدا ہونے والا بچہ یقیناً اس میں بھی وہ صفات آ جائیں گی۔

بہرحال ــــ!

دو قسم کے خاندان ہیں: ایک صاحبانِ کمال اور ایک ایسا خاندان ہو کہ جس میں صاحبانِ کمال لوگ نہ ہوں۔ تو اگر ایک ایسا خاندان کہ جس میں پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں تو اگرچہ اس میں تعلیم کی طرف جانے میں مشکلات زیادہ ہوں گی کیونکہ ایک ایسا ماحول کہ جہاں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہے۔ کوئی راغب نہیں ہے تو کوئی اپنے دل کو تھام کر تعلیم حاصل کرے تو بڑا مشکل ہوگا لیکن اُن کی نسبت اس کا صاحبِ کمال ہونا آسان ہوگا۔ تو مثلاً ایک خاندان میں ایک آدمی کچھ بھی نہیں پڑھا ہوا تو اگر ایک آدمی پانچ جماعتیں بھی پڑھا ہوا ہو تو وہ پڑھا لکھا تصور کیا جائے گا۔

اسی طریقے سے کوئی بھی کمال ہو، کہ اگر ایسے لوگوں میں پیدا ہوا کہ جس میں صاحبانِ کمال نہیں ہیں تو وہ تھوڑے سے کمال سے اپنی شہرت، اپنی عظمت پیدا کر سکتا ہے۔

اور اگر کوئی شخص ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے کہ جس میں صاحبانِ کمال لوگ ہیں، پڑھے لکھے لوگ ہیں تو اب اگر وہ چاہتا ہے کہ میں اپنے خاندان میں ممتاز قرار پاؤں تو پھر اس کو ان میں سے زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ کیونکہ وہ

پڑھے لکھے لوگ ہیں۔

ذکرِ مصائب: شہادت جنابِ علی اکبرؑ

اب آپ کے مولا حسینؑ اس خاندان میں پیدا ہوئے کہ اس خاندان کے جس فرد کو دیکھیں تو وہ کمال کی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ پوری دنیا میں اگر کوئی نانا ہے سید المرسلینؐ، باپ ہے تو امیر المومنینؑ، سیدالوصیینؑ، ماں ہے تو سیدۃ نساء العالمینؑ۔ تو اس ماحول میں اگر کوئی چاہتا ہے کہ دنیا کی نگاہیں میری طرف اُٹھیں، دنیا میری طرف بڑھے اور مجھ سے فیض حاصل کرے تو اس کو کتنی محنت کرنی پڑے گی۔

لہٰذا حسینؑ نے اس پوری کائنات میں ایک ایسا انداز اپنایا کہ جتنا ذکر دنیا میں حسینؑ کا ہوتا ہے خدا کے بعد، اور ختمی مرتبتؐ کے بعد، اور جتنی دفعہ نام حسینؑ کا لیا جاتا ہے، اتنا کسی کا نہیں لیا جاتا۔ اور پھر خدا کے مخالف ہیں، اس کو نہیں مانتے۔ پیغمبرؐ کے مخالف ہیں ان کو نہیں مانتے، جنابِ امیرؑ کے مخالفین ہیں، ان کو نہیں مانتے، حسینؑ نے ایک نرالا طرزِ عمل اختیار کیا کہ اس قسم کے لوگ جو نہ خدا کے سامنے جھکتے ہیں، نہ رسولؐ کے سامنے جھکتے ہیں، نہ امیر المومنینؑ کے سامنے جھکتے ہیں مگر یہ حسینؑ کی عظمت ہے کہ ہر کوئی یاد کر رہا ہے۔

علیؑ نے جنگ کی، یقیناً علیؑ سا بہادر اس دنیا میں نہیں پیدا ہوا، لیکن جنابِ امیرؑ نے کبھی بھی پیاسے ہو کر جنگ نہیں کی، علیؑ نے کسی جنگ میں ۷۲ لاشے اُٹھانے کے بعد جنگ نہیں کی۔

آپ تصور نہیں کر سکتے کہ جب آپ نے روزہ رکھا ہوا ہو اور گرمی کے دن

ہوں اور پھر شام کو جب افطار کریں تو آپ کو اس وقت پیاس کی قدر معلوم ہوگی۔ حالانکہ آپ سایہ میں ہوتے ہیں اور آپ کو آرام کے وسائل مہیا ہوتے ہیں۔ کبھی آپ جا کے دیکھئے ان علاقوں کو کہ جو ریتلے علاقے ہیں۔ جب ان میں دھوپ پڑتی ہے تو پھر وہاں پر آپ دانہ بھی پھینکئے تو وہ بھی بھن جائے گا۔

تو اس علاقے میں حسینؑ تنہا نہیں، چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ، انصار کے ساتھ، تین دن کے بھوکے اور پیاسے تھے۔ اکثر اصحاب حسینؑ کا عالم یہ ہوگیا تھا کہ وہ پیاس کی وجہ سے اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ بول نہیں سکتے تھے اور چھوٹے چھوٹے بچے جب انہیں پیاس تنگ کرتی تھی تو وہ بچے اس خیمے میں جاتے تھے جہاں خشک مٹکے رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ شاید ان مٹکوں کا نچلا حصہ ٹھنڈا ہو، کپڑے اُتار کر وہ بچے اپنے سینوں کو اس زمین سے لگاتے تھے کہ شاید ٹھنڈک محسوس ہو۔

اکبرؑ جیسا جوان بیٹا حسینؑ کے پاس آیا۔ میدانِ جنگ سے جب واپس پلٹا اور یہ جانتے ہوئے کہ تین دن سے پانی نہیں ہے، پھر پانی کا سوال کرنا۔ اس بات کی دلیل ہے کہ اکبرؑ کتنے پیاسے تھے۔ جوان بیٹا کوشش کرتا ہے کہ میرے بوڑھے باپ کو میری تکلیف محسوس نہ ہو، اس کو دکھ ہوگا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اکبرؑ سے رہا نہیں گیا، برداشت نہیں کر سکے، تو عرض کیا: بابا! کیا ایک گھونٹ پانی کا مل سکتا ہے۔

اولاد والو____!

باپ کو پتہ ہو کہ میرا بیٹا اس دنیا سے جا رہا ہے اور یہ آخری سوال کر رہا ہے تو اس کی کوشش ہوگی کہ میرا بیٹا خالی واپس نہ جائے۔

حسینؑ نے کہا کہ بیٹا اپنی زبان میرے منہ میں ڈال دو اور جب اکبرؑ نے اپنی زبان حسینؑ کے منہ میں داخل کی تو فوراً نکال لی اور کہا کہ بابا! آپؑ کی زبان تو میری زبان سے بھی زیادہ خشک ہے۔

فرمایا: اچھا بیٹا یہ انگشتری لو اور اسے اپنے منہ میں رکھو اور میدان میں جاؤ تو ابھی تمھیں ناناؐ سیراب کریں گے، تو اکبرؑ میدان میں گئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کو احساس ہوا کہ میری وجہ سے میرے باپ کو دکھ ہوا ہے۔ ہر شہید جب گھوڑے سے گرا ہے تو اس نے آواز دی ہے کہ مولاؑ میری مدد کو آیئے، اکبرؑ نے آواز نہیں دی بلکہ یہ بھی نہیں چاہا کہ حسینؑ کو سلام کا جواب دینا پڑے اور اکبرؑ نے فرمایا:

عَلَیكَ مِنِّی سَلَامٌ

"بابا! میری آخری سلام ہو"۔

اور اس کے بعد ایک فقرہ کہا کہ بابا ناناؐ آئے ہیں اور وہ کوثر کا پانی لے کر آئے ہیں اور انہوں نے مجھے پلا دیا ہے۔ یعنی اکبرؑ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میرے باپ کو یہ دکھ رہے گا کہ میں بیٹے کو پانی نہیں پلا سکا۔ لہٰذا اکبرؑ کہتے ہیں کہ ناناؐ آئے ہیں، پانی بھی لے آئے ہیں اور انہوں نے مجھے پلا دیا ہے۔ اس کے بعد مجھے کبھی پیاس نہیں لگے گی۔

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ پیغمبرؐ نے ہر شہید کو پانی پلایا ہوگا جو جلدی شہید ہو جاتا تھا وہ جلدی سیراب ہو جاتا تھا۔

پہلے اصحابِ حسینؑ شہید ہوتے رہے، پھر خاندانِ رسالتؐ کے افراد شہید ہوئے، آخر میں جنابِ عباسؑ شہید ہوئے اور حسینؑ آخر میں رہ گئے۔

مولانا علی نقی صاحب کا یہ فقرہ بہت پسند آیا کہ کربلا کے میدان میں دسویں کے دن مرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا جینا مشکل تھا۔

تو سب کے آخر میں حسینؑ رہ گئے۔ لہٰذا حسینؑ سب سے زیادہ پیاسے ہوں گے حتیٰ کہ چھوٹے بچوں تک کو احساس تھا اور یہی وجہ ہے۔

میرے دوستو ــــ!

کہ سید سجادؑ سے جب الوداع کیا تو کہا کہ بیٹا جب مدینہ پلٹ کر جاؤ تو میرے شیعوں کو میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ

"اے شیعو! جب بھی ٹھنڈا پانی پیؤ تو میری پیاس کو یاد کرنا"۔

اور دوسرا یہ کہ یاد رکھو کہ جس کے دروازے پر فرشتے آ کر سوال کرتے ہوں، اگر اس کو سوال کرنا پڑے اور اس کا سوال رد کردیا جائے تو اس کو کتنا دکھ ہوگا۔

حسینؑ نے ایک اور بات بھی یاد دلائی کہ

"اے شیعو! کاش تم کربلا کے میدان میں ہوتے تو دیکھتے کہ میں چھ ماہ کے بچے کو لے کر کس طریقے سے رسولؐ کی اُمت کے پاس گیا تھا کہ اسے پانی دو لیکن ہائے افسوس! کہ انہوں نے پانی نہ دیا"۔

●……●……●



ادارہ منہاج الصالحین لاہور